

صبح ہم نے پولیس کو اطلاع دی۔“

”جو دو لوگ کار پہ لاش پھینکنے آئے تھے آپ ان کو پہچان لیں گے؟“

”جی ہاں جی۔ یہ دونوں۔“ پہلے فارس کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ڈرائیونگ سیٹ پہ تھا“ اور یہ (ناظم کی طرف انگلی اٹھائی) یہ فرنٹ

سیٹ پہ تھا۔“

”کیا انہوں نے چہروں پہ کوئی نقاب پہن رکھے تھے؟“

”نہیں جی منہ کھلا تھا۔ بالکل صاف اور واضح۔“

پراسیکیوٹر نے سر کو خم دیا، اور پھر واپس اپنی کرسی کی طرف آتے ہوئے زمر کو دیکھ کر "your witness" کہتے ہوئے جرح کی دعوت دی۔ زمر اپنی جگہ سے اٹھی اور قدم قدم چلتی کٹھن کے قریب آئی جہاں وہ بہنوئی کھڑا تھا۔ یہاں سے فارس کو اس کا نیم رخ دکھائی دیتا تھا۔ آدھے بندھے گھنگریالے بال پشت پہ اور ناک میں دکتی سونے کی نتھ۔ (اسے بے اختیار سیاہ ڈبی میں مقید وہ لوگ یاد آئی جواب بھی ان کے کمرے کی ڈرائیونگ ٹیبل پہ پڑی تھی۔ زمر نے اس رات کے بعد اسے چھو اتک نہ تھا۔) چہرے پہ بے پناہ سنجیدگی لئے اس نے بہنوئی محمد اقبال کو دیکھا۔

”اقبال صاحب، سیٹلائٹ فون کی قیمت کتنی ہوتی ہے؟“

”جی؟“ اقبال نے الجھ کر اسے دیکھا۔ پراسیکیوٹر قدرے بے زار سا کھڑا ہوا۔

”آج جیکشن یور آئزر۔ کاؤنسلر غیر متعلقہ سوال ہو چھ رہی ہیں۔“

(ایک وکیل کے کسی سوال پہ دوسرا وکیل جب اعتراض کرے تو جج یا تو اس اعتراض کو "اور رول" کہہ کر رد کرتا ہے یا سسٹینڈ کہہ کر برقرار رکھتا ہے.....)

”اور رولڈ، لیکن آپ اپنے سوال کا مدعے سے تعلق جلد واضح کریں۔“ جج صاحب نے عینک کے پیچھے سے زمر کو دیکھتے تنبیہ کی۔

اس نے نخل سے سر کو خم دیا اور سوال دہرایا۔ ”سیٹلائٹ فون کی قیمت کتنی ہوتی ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”کیا اس لئے کہ آپ نے کبھی سیٹلائٹ فون استعمال نہیں کیا؟“

”جی بالکل میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔“

”اقبال صاحب آپ نے اپنے بیان میں کہا کہ جب یہ دونوں اشخاص کار میں آئے تو آپ گیٹ پہ کھڑے تھے۔ آپ وہاں کیا کر

رہے تھے؟“ اسی سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں فون پہ بات کر رہا تھا اپنے بھائی سے۔ آپ میرے فون کا بل چیک کر سکتی ہیں۔“ گردن کڑا کر بولا۔ زمر نے اثبات میں سر

کو جنبش دی۔

”آپ کے بل میں بارہ بج کر بیس منٹ پہ اپنے بھائی کو تین منٹ کی کال کرنے کا ریکارڈ موجود ہے“

درست۔ ”ذرا کی۔“ لیکن... اس نے پراسیکیوٹر اسکرین کی طرف اشارہ کیا جہاں قمر الدین کے گھر کی تصاویر پراسیکیوٹر نے ڈسپلے کر رکھی

تھیں۔ وہ سڑک جہاں لاش پھینکی گئی۔ وہ گیٹ جہاں بہنوئی کھڑا تھا۔

”لیکن قمر الدین کے گھر کے سامنے ایک لڑکیوں کا اسکول ہے کیا آپ نے یہ دیکھ رکھا ہے؟“

پراسیکیوٹر ابرو ہنچ کر آگے ہو کر بیٹھا اور توجہ سے سننے لگا۔ فارس کا بھی کان کی لو کو مستلما ہاتھ رک گیا، آنکھیں سکڑیں۔

”جی دیکھ رکھا ہے۔“ زمر واپس میز تک آئی اور چند کاغذات اٹھائے۔

”یہ اسکول کی انتظامیہ کی طرف سے ایف ڈی ٹی کے چند معزز لوگوں کی طرف سے حلف نامے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ....“ باری باری چند کاغذات جج صاحب کی ڈیسک پہ اور پھر پراسیکیوٹر کی میز پر رکھے۔ ”کہ ہر روز صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک اسکول میں جمر لگائے جاتے ہیں تاکہ وہ لڑکیاں جو چھپ کر موبائل لاتی ہیں وہ ان کو نہ استعمال کر سکیں۔ اور محلے والوں کے مطابق ان جیمز کا دائرہ اتنا ہے کہ قریبی گھروں کے وہ حصے جو اسکول کے سامنے پڑتے ہیں وہاں ان اوقات میں موبائل اسٹولز نہیں آتے جن کی وجہ سے وہ کافی دفعہ اسکول والوں سے شکایت بھی کر چکے ہیں۔ سو اقبال صاحب، میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ اس گیٹ پہ جہاں میں خود بارہ بج کر بیس منٹ پہ جا کر موبائل سے کال کرنے کی کوشش میں ناکام ہو چکی ہوں وہاں آپ موبائل پہ اتنی لمبی گفتگو کیسے کر سکتے ہیں؟ الایہ کہ آپ کے پاس سیٹلائٹ فون تھا؟“

”آپ جیکشن پور آئے؟“ پراسیکیوٹر جلدی سے کھڑا ہوا۔ زمر نے مڑ کر اسے دیکھا۔ ”کس وجہ کی بنا پہ؟“

”کاؤنسلر غیر متعلقہ بات کر رہی ہیں۔“

”یور آئے؟“ اس گواہ کے مطابق یہ بارہ بج کر بیس منٹ پہ اس گیٹ پہ موجود تھا، صرف تب ہی یہ کار پہ آنے والوں کی شکلیں دیکھ سکتا ہے لیکن اگر وہاں گنل نہیں آتے تو پھر یہ ثابت ہوتا ہے کہ گواہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھا اور وہ فون اس نے کسی اور جگہ پہ سنا تھا۔“

”اوور رولڈ!“ پراسیکیوٹر قدرے غیر آرام دہ سا بیٹھا۔ جج نے گواہ کو جواب دینے کا اشارہ کیا۔ وہ اب تک سنبھل چکا تھا۔

”میرا خیال ہے میں نے بات گھر کے اندر کی تھی وہاں گنل آتے ہیں اور میں بات کر کے باہر آیا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ....“

”آپ کو یہ یاد نہیں کہ آپ نے بات کہاں کی؟ آپ کو یہ یاد نہیں کہ آپ وہاں کیوں کھڑے تھے مگر آپ کو یہ یاد ہے کہ ان دونوں کی شکلیں کیسی تھیں اور یہ کہ ان کی کار کی نمبر پلیٹ غائب تھی؟“ اسی سنجیدگی سے وہ پوچھ رہی تھی۔

”دیکھیں، کافی دن گزر چکے....“

”آپ فوراً قمر الدین صاحب کو ہسپتال لے کر گئے تھے؟“ بات کاٹ کر اس نے اگلا سوال داغا۔ گواہ نے سر اثبات میں

بلایا۔ ”جی ہاں۔“

”اور ان کے میڈیکل معائنے کے وقت آپ وہاں موجود تھے؟“

”جی۔“

”تو پھر کیا وجہ ہے کہ قمر الدین چودھری کی میڈیکولاجیکل رپورٹ پہ جو ”دوست / رشتہ دار“ کا خانہ ہوتا ہے، جس میں اس شخص کا نام لکھا جاتا ہے جو طبی معائنے کے وقت ساتھ ہو، وہ خانہ خالی کیوں ہے؟“ اس نے رپورٹ کی ایک ایک کاپی جج اور پراسیکیوٹر کے سامنے رکھی تیسری گواہ کے ہاتھ میں دی۔ گواہ نے تھوک نگلا۔ سر اٹھا کر پراسیکیوٹر کو دیکھا۔ وہ کاغذ پڑھتے ہوئے تیزی سے اٹھا۔ ”یور آئے؟“ اکثر سے بھول چوک ہو سکتی ہے اتنے مریضوں کی موجودگی میں اکثر ڈاکٹر اس خانے کو ہڈ کرنا بھول جاتے ہیں۔“

”دومریض، دولائشیں، دورپورٹس!“ وہ مزید چند کاغذ میز سے اٹھا کر لائی اور جج صاحب کے سامنے رکھے۔ ”29 اگست کو ڈاکٹر سعادت نے قمر الدین چودھری کے علاوہ مزید دولائشوں کی میڈیکولاجیکل رپورٹس تیار کی تھیں، ان دونوں میں دوست / رشتہ دار کا خانہ بھرا ہوا ہے۔ اگر ڈاکٹر کو وہاں یاد رہا، تو اسے یہاں کیوں بھول گیا؟ یا پھر....“ گواہ کے سامنے کھڑے ہو کر مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”آپ وہاں موجود ہی نہیں تھے، بلکہ آپ کو پراسیکیوٹر نے رٹی رٹائی کہانی یاد کرنے کو کہا ہے؟“

فارس ہلکا سا مسکرایا۔ یہاں سے ابھی تک زمر کا نیم رخ دکھائی دے رہا تھا، مگر اس کا انداز، اس کی نرم سی سختی۔۔۔ اسے خود بھی نہیں

یہ تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

”آب جیکشن پور آرز۔“ پراسیکیوٹر غصے سے بولا اور جج صاحب نے فوراً سے ”sustained“ کہتے ہوئے زمر کو تنبیہی نظروں سے دیکھا بھی تھا، مگر وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر ”withdrawn“ کہتی واپس کرسی پہ جا بیٹھی۔

”مجھے مزید کوئی سوال نہیں کرنا مگر میں گواہ کو دوبارہ بلا کر جرح کرنے کا حق محفوظ رکھنا چاہتی ہوں۔“ اب وہ عدالت کو اطلاع دے رہی تھی۔

فارس نے مسکراتے ہوئے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے مگر پھر رک گیا۔ اور مسکراہٹ دہالی۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ وہ اس کی تعریف کرتا۔



چلی جو سیل رواں پہ محبت کی کشتی تو اس سفر کو محبت کے نام میں نے کیا
سندھ میں ایک طویل عرصے کی تعیناتی کے بعد اس کو بالآخر اپنے شہر میں واپس بلا لیا گیا تو وارث خوش تھا۔ اس کے خیال میں فارس کے کیریئر سے کلک کا ٹیکا اتر گیا تھا اور اس کی ترقی کے چانسز بڑھ گئے تھے۔ مگر اس کی خوش گمانی چند ہفتوں میں ہی ختم ہو گئی اور فارس کے کولیگ سے ملنے کے بعد وہ سیدھا قصر کاردار کی انکسی میں آیا تھا۔

”اب میں نے کیا کیا ہے؟“ اس نے فریج سے سافٹ ڈرنک کے دو کین نکالتے ہوئے مسکرا کر پوچھا تھا۔ پھر سیدھا ہو کر پلٹا تو دیکھا وارث گلاسز کے پیچھے سے اس کو تندہی سے گھور رہا تھا۔
”مسئلہ یہ ہے کہ اس دفعہ تم نے کچھ نہیں کیا۔“

”تم میرے پاس کی طرح باتیں کیوں کرتے ہو؟“ ایک کین اس کی طرف اچھالا اور دوسرا کھول کر خود صوفے پہ آگرا۔ وارث نے سختی سے لب بھینچے کین میز پہ بچھا اور اس کے سامنے بیٹھا۔ ”تمہارے سامنے ایک شخص گن لہراتا ہوا بھاگ گیا اور تم نے اس پر گولی نہیں چلائی!“
”اس نے ایک بچے کو ریغمال بنا رکھا تھا“ اس کی گردن پہ پستول رکھ کر اس کو ڈھال بنا کر وہ کھڑا تھا، میں بچے کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔“ اور کین لبوں سے لگائے گھونٹ بھرا۔

”تو تمہیں اس کے بازو پہ گولی مارنی چاہیے تھی“ اس رگ پہ جس کے کٹتے ہی وہ ٹریگر دبانے سے مفلوج ہو جاتا۔ ڈونٹ ٹیل می کہ تمہیں کسی نے یہ سب نہیں سکھایا۔“

فارس نے کین رکھا اور سنجیدگی سے آگے ہوا۔ ”وارث... وہ ایک انسان تھا۔ اس پہ اسمگلنگ کے جتنے مقدمے ہوں وہ ایک انسان تھا“ میں ایک انسان پہ گولی نہیں چلا سکتا تھا“ اس اینگل سے میرا بیسٹ شاٹ اس کی کپٹی پہ لگتا“ اور میں قتل نہیں کرنا چاہتا تھا کسی کو۔“
”اور تمہیں کیا لگتا ہے وہ بھاگ کر جو گیا ہے تو کیا اب مسجد میں میلاد کروا رہا ہوگا؟ نہیں غازی۔ وہ جتنے لوگوں کی زندگیاں منشیات سے خراب کرے گا وہ تمہارے سر ہوں گی۔“ فارس چند لمحے خاموش رہا۔

”سارہ کیسی ہیں؟“ وارث نے مزید غصے سے اسے دیکھا۔
”ناپک مت بدلو قتل کرنا جرم ہوتا ہے مگر ڈیوٹی کی لائن میں فساد فی الارض کرنے والوں کو مارنا ثواب کا کام ہوتا ہے۔“

”کیا معلوم وہ توبہ کر لے؟ نیک ہو جائے؟ میں نے جو بھی کیا بچے کو بچانے کے لئے کیا ہاں ٹھیک ہے“ میری کمزوری ہے یہ کہ میں ایک انسان پہ گولی نہیں چلا سکا مگر.... ہو سکتا ہے وہ بدلنے والا ہوتا اور میں اس کا چانس اس سے چھین لیتا۔“
اس بات پہ وارث غازی پورے دل سے مسکرایا تھا۔

”میری ایک نصیحت ساری زندگی یاد رکھنا‘‘ فارس۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا تھا۔ ”انسان نہیں بدلا کرتے۔“
لاکھوں میں سے ایک دو تو بدل سکتے ہیں، مگر ہر کوئی نہیں بدلتا۔“

یہ نصیحت بھلانے میں اسے چند دن لگے تھے، مگر ذہن کے کسی نہاں خانے میں یہ انک ضرور گئی تھی، لیکن یہ وہ دن تھے جب دل اور دماغ میں اور بھی بہت کچھ چل رہا تھا۔ اس نے زمر کی یونیورسٹی جوائن کر لی تھی۔ شام کی کلاسز وہ اس سے لینے لگا تھا اور یہ اس کو خود بھی معلوم تھا کہ پورے شہر میں ایک یہی یونی تو نہیں تھی۔ پھر وہ ادھر کیوں آتا تھا؟ صرف اس کے لئے۔

اس سے قبل ان دونوں کی ملاقات زیادہ ندر ہی تھی، بلکہ رسمی سلام سے زیادہ اس نے کبھی اس سے بات بھی نہ کی تھی، اور سندھ میں قیام کی اس طویل مدت کے دوران اس کو وہ بھول بھال بھی گئی تھی مگر یہاں آنے کے بعد... ایک روز اس نے اسے سعدی کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا، اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اگر اس نے اس لڑکی کو کھو دیا تو دنیا میں کوئی اور اس کے لئے نہیں ہوگا۔

وہ اس کی یونی جانے لگا، اس سے بات کرنے کے مواقع تلاش کرنے لگا، اس کا زیادہ سے زیادہ وقت لینے کے بہانے ڈھونڈنے لگا، اور وہ ہمیشہ ہی اسے ایک طرح سے ذیل کرتی تھی۔ احترام اور عزت کے ساتھ، مگر ریزرو اور دور۔ وہ خوبصورت نہیں تھی، شکل و صورت میں وہ محض واجبی تھی، رنگت بھی گندی مائل تھی، بال خوبصورت تھے، مگر نہ وہ بننے سنورنے کی شوقین تھی، نہ وہ کسی سے بے وجہ بات کیا کرتی تھی۔ زیور کے نام پہ وہ صرف ناک میں نتھ پہنتا کرتی تھی۔ شاید اسے اپنی ناک بہت عزیز تھی!

وہ بہت اچھی تھی، یا پھر اسے لگتی تھی۔ محبت کرنے والی، مگر مضبوط، دبنگ اور کبھی کبھی ذرا ضدی۔ نرم لہجے میں سخت باتیں کر جاتی تھی۔ قلم سے کاغذ پہ لکھتے لکھتے، کسی بے معنی بات پہ وہ بس ایک ابرو اٹھا کر اسے دیکھتی، اور پھر واپس کام کرنے لگ جاتی اور اس کا یہ انداز سامنے والے کو پیچھے ہٹنے پہ مجبور کر دیتا تھا۔ وہ دل کی اچھی تھی۔ مہربان، اور نرم سی۔ اس میں ہر وہ خوبی تھی جو اس جیسے مرد کو متوجہ کرتی، مگر وہ اس معاشرے کا مرد تھا، جس کے لئے اپنی عزت اور عزت کا بھرم ہر شے سے اوپر تھا، کیونکہ آخر میں وہ تھی تو بیگم ولایت کے خاندان سے نا!

قصوں کہانیوں اور فلموں میں محبت کی شادیاں سحر انگیز لگتی ہوں، حقیقت اس سے مختلف تھی۔ وہ ابھی اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ جو بھی سنتا، آگے سے کہتا، اچھا... وہ دونوں ایک یونیورسٹی میں ساتھ ساتھ... اور اس سے آگے کی معنی خیز مسکراہٹیں، اور آنکھوں کی چمک... فارس کی طبیعت کو یہ گوارا نہ تھا۔ بہت سالوں کی ریاضت کے بعد، کتنے اسباق سیکھ کر اور کتنی اذیت کاٹ کر وہ وارث اور ندرت ایک خاندان بنے تھے۔ وہ بالآخر ان کے خاندان میں، دوسری بیوی کا بیٹا، نہیں، بلکہ ندرت اور وارث کا بھائی سمجھا جانے لگا تھا، وہ اس عزت پہ حرف بھی نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔

سو اس نے تاخیر کی، اور پھر وہ تاخیر کرتا گیا۔ یونیورسٹی چھوڑنے کے کچھ عرصے بعد وہ عزت سے اس کے لئے رشتہ بھجوا دے گا۔ ”مگنی“ شادی، اپنے شہر میں پوسٹنگ، متوقع ترقی، اچھی جاب، بچے... فارس غازی کی زندگی کی ساری ترجیحات اس کے ساتھ تھیں۔

بہت ہی صفائی اور سلیقے سے آراستہ اور مرتب شدہ!



دشت میں پیاس بجھاتے ہوئے مر جاتے ہیں ہم پرندے کہیں جاتے ہوئے مر جاتے ہیں
شیشوں سے ڈھکی عمارت کے اندر سورج کی نرم گرم کرنیں گر رہی تھیں۔ سیکرٹری حلیہ اپنے ڈیسک کے پیچھے کھڑی ہاشم سے بات کر رہی تھی، جونوں پہ بٹن دبا تا، ذرا دیر کو اس کی بات سننے کے لئے رکھا تھا۔

”سر آپ ٹھیک ہیں؟“ حلیہ نے رک کر پوچھا تو ہاشم نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ گرے سوٹ اور گرے ویسٹ میں ملبوس، بال پیچھے کو جیل سے بنائے، وہ ہمیشہ کی طرح ہینڈ سٹاک رہا تھا، مگر اس کی آنکھیں بے خوابی کا شکار لگتی تھیں۔

”تھینک یوحیمہ میں ذرا اور ورکڈ ہوں۔“ پھر ٹھہر کر پوچھا۔ ”خاور کا کچھ پتہ چلا؟“
 ”نہیں سر۔ اس کی وہی امی میل آئی تھی مجھے۔ کہ کچھ دن کے لئے وہ روپوش ہو رہا ہے۔ پولیس اس کے پیچھے ہے۔ اس کے بیٹے کو
 امی اس کا یہی نتیجہ ملا ہے وہ بھی مجھ سے کئی بار پوچھ چکا ہے۔ آپ کو کچھ نہیں بتایا؟“
 ”نہیں، مجھے اس نے کچھ نہیں بتایا۔“ ہاشم نے افسوس بھری لاعلمی سے شانے اچکائے اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔
 رئیس اس کا منتظر تھا۔ دروازہ بند کرتے ہی وہ اس کے سامنے آیا۔ ہاشم نے کرسی پہ بیٹھتے ہوئے اس پہ ایک سنجیدہ نظر ڈالی۔
 ”پراگریس؟“

”سر ہر طرح کی نارچر تکنیک استعمال کر چکے ہیں، وہ نہیں اعتراف کرتا۔ بہت سخت جان ہے!“
 ”میں جانتا ہوں!“ ہاشم نے لیپ ٹاپ کھولتے ہوئے سر کو خم دیا۔ ”اس کو کڑی نگرانی میں رکھو اور مزید کوشش کرو۔ مجھے اس شخص کا
 نام چاہیے جس کے کہنے پہ اس نے میرے باپ کو مارا ہے یا اگر وہ اکیلا کام کر رہا تھا تو مجھے اس کا motive سننا ہے۔ بغیر وجہ کے کوئی قتل نہیں
 کرتا۔ اب جاؤ!“ ابرو سے اشارہ کیا اور پھر انہی تنے تاثرات کے ساتھ اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔
 ”سرفارس غازی کا دو دفعہ پیغام آیا ہے وہ آپ سے.....“
 ”ہاں مجھے یاد ہے۔ اگلے ہفتے میں جاؤں گا اس سے ملنے۔“ مصروفیت اور قدرے بے زاری سے کہہ کر وہ کام کرنے لگا۔ رئیس سر
 ہلا کر مڑ گیا۔

اور ہزاروں میل دور... بسند کنارے بنے ہوٹل کے تہہ خانے میں مستعد گارڈز اسی طرح اپنی جگہوں پہ کھڑے تھے۔ پتھر جیسے
 چہرے بنائے چاق و چوبند اور الٹ۔ تبھی سعدی کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا خالی گلاس تھا جو
 اس نے باہر میز پہ دھرا، پھر سنجیدہ چہرے کے ساتھ گارڈز کی طرف آیا۔
 ”مجھے اس سے ملنا ہے۔“ یہ اجازت اسے چند دن پہلے سے ہی ملنے لگی تھی، سو گارڈ سر ہلا کر اسے راہداری میں آگے لے آیا۔ ایک
 دوسرے کمرے کا لکڑی کا دروازہ کوڑبا کر کھولا تو سعدی نے اندر قدم رکھا۔ پیروں میں نرم سلیپرز اور پر جینز پہ ہلکی جرسی شرٹ پہننے وہ تندرست اور
 توانا لگتا تھا، اس کے برعکس دوسرے قیدی کا حال مختلف تھا۔

اس کے ہاتھ اور پیر جڑی ہتھکڑیوں سے بندھے تھے، جن سے لنگتی زنجیریں دیوار میں نصب تھیں۔ زمین پہ بیٹھا، دیوار سے ٹیک
 لگائے، وہ آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ چہرے اور گردن پہ زخموں کے نشان اور پرانے کپڑوں پہ لگے کٹ اور خون کے دھبے۔ بند آنکھوں کے
 گرد نظر آتے نیل۔ سعدی نے بالکل بے تاثر لگا ہوں سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔
 ”ہیلو خاور!“

خاور نے نیل نیل آنکھیں کھولیں۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور ہونٹ پہ بھی خون جما تھا۔ آنکھوں میں برہمی اور چھین لئے اس نے
 سعدی کو دیکھا۔

”کیا دیکھنے آئے ہو؟ یہی کہ میں زندہ ہوں یا نہیں؟“ پھر ہلکا سا مسکرایا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں
 ہوں بچے۔ تمہیں کیا لگتا ہے، تم میرے اوپر الزام لگا کر ہاشم کو مجھ سے بدظن کر دو گے؟ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“

پھر اٹھا۔ درد کی ٹیسیں انھیں مگر ضبط کر کے وہ سیدھا سعدی کے سامنے کھڑا ہوا۔
 ”میں تمہاری ساری گیم سمجھ گیا ہوں۔ پہلے دن سے سمجھ گیا تھا۔ تم ہاشم اور مجھے توڑنا چاہتے ہو، چاہتے ہو میں قید میں مرجاؤں اور تم
 ہاشم کو تنہا کر کے مارو۔ ڈیوائیڈ اینڈ رول! ہے نا؟“

سعدی ہلکا سا مسکرایا۔ بولا کچھ نہیں۔ اس کی گردن پہ سرخ خراش کا مندل نشان اب بھی موجود تھا۔ کوئی چار روز قبل اسے پہلی دفعہ خاور سے ملاقات کی اجازت ملی تھی تو خاور نے اپنی زنجیر کو اس کی گردن میں پلیٹ کر اسے مارنے کی کوشش کی تھی جسے بروقت گارڈز نے ناکام بنادیا تھا۔ وہ اس کو دیکھتے ہی بکنے جھکنے لگتا تھا۔ آج جیسے اونچا بولنے سے وہ اکتا چکا تھا سو آواز نازل رکھی تھی۔

”کہا تھا میں نے ہاشم کو۔ سعدی یوسف فرشتہ نہیں ہے۔ کہاں گیا تمہارا اسلام! تمہارا دین جب تم مجھ پہ ناکردہ گناہ کا الزام لگا رہے تھے؟“ حقارت سے اسے دیکھا۔

سعدی ہلکا سا ہنسا پھر سر جھٹکا۔

”ہیرا ہیرے کو کاٹتا ہے، کاردار زکو کاٹنے کے لئے کاردار جیسا بننا پڑتا ہے، ان جیسا سوچنا پڑتا ہے۔ چار سال...“ انگوٹھا اندر کر کے چار انگلیاں اس کو دکھائیں۔ ”چار سال میں نے قانون، وکیلوں، عدالتوں کے ساتھ تعاون کر کے انصاف حاصل کرنے کی کوشش کی ہے مگر نہ میں فارس غازی کو قانونی طریقے سے نکال سکا، نہ وہ مجھے نکال سکے گا۔ سو جو قانون انصاف نہیں دے سکتا، وہ ہاتھ نہیں کاٹ سکتا۔ اس لئے بہت سادہ طریقہ ہے انتقام لینے کا، ہاشم کو تمہارے خلاف بھڑکا کر تمہیں اسی کے ہاتھوں سے مروادوں۔“ وہ سانس لینے کو رکا۔ خاور اسی طرح غصے اور نفرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”مگر میں یہ سب انتقام کے لئے نہیں کر رہا۔ اس لئے تمہیں مروانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ خاور کے ابرو بچھنے، وہ ذرا چونکا تھا۔

”میں تمہیں نہیں مروانے لگا کر نل خاور۔ میں صرف تمہیں سولی چڑھا رہا ہوں، کیونکہ تم میری آزادی کا پروانہ ہو۔“

”ایک منٹ تم...“

”نہیں، میں تمہیں ہاشم کے خلاف بھی نہیں استعمال کرنے لگا، میں نے صرف تمہیں سولی چڑھانا تھا، تمہاری گردن کا ٹنا ہاشم کا کام ہے، مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا، کیونکہ اسے کبھی یقین نہیں آئے گا کہ تم اس کے باپ کے قاتل ہو۔“

خاور آنکھیں سیڑھے تعجب اور ناگواری سے اسے گھورتے قریب آیا۔ سعدی سے دو قدم دور اس کی زنجیر کس گئی۔ وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے ہاشم تمہیں قاتل سمجھتا ہے؟ اوہ ہوں۔“ لڑکے نے مسکراتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔

”وہ شک میں ہے۔ اسے صرف ایک چیز تمہارے قاتل ہونے کا یقین دلا سکتی ہے اور وہ ہے تمہارا اقبال جرم!“

”جو میں کبھی نہیں کروں گا۔“

”مگر تمہارے اقبال جرم نہ کرنے سے وہ تمہاری بے گناہی مان نہیں لے گا۔ میں نے کہا نا، وہ شک میں ہے، اگر یقین ہوتا اسے

تو وہ تمہیں اب تک مار چکا ہوتا۔ صرف ایک چیز اس کو تمہاری بے گناہی کا یقین دلا سکتی ہے، اور وہ ہے.... میرا اقبال جرم! کہ میں نے تم پہ الزام لگایا۔“

”تمہارے بار بار بیان بدلنے سے تمہاری کریڈیبلٹی ختم ہو جائے گی۔“

”جب میں اسے اصل قاتل کا نام بتاؤں گا، تو تم بری ہو جاؤ گے۔ میں نے تمہیں صرف سولی پہ چڑھانا تھا، سزائے موت نہیں

دینی۔ مجھے معلوم تھا ہاشم تمہیں مارے گا نہیں بلکہ تمہیں اپنی بہترین جیل میں قید کر دے گا۔ یوں تم میرے پاس آ جاؤ گے۔ تم میری آزادی ہو خاور۔ میں نے اتنے مہینے سوچا کہ مجھے یہاں سے کون نکالے گا۔ فارس، زمر، میری بہن، کوئی دوست.... مگر نہیں۔“ مسکرا کر کہتا دو قدم قریب آیا اور انگلی سے خاور کے سینے پہ دستک دی۔ ”مجھے یہاں سے تم نکالو گے۔ اور میں تمہارے حق میں گواہی دے دوں گا۔ ہم دونوں آزاد ہو جائیں گے۔“ خاور نے سختی سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

”اور مائی ڈیڈ باڈی سعدی یوسف!“ وہ اس کو گھورتے چبا چبا کر بولا۔ ”اگر مجھے آزاد ہونا ہوتا تو پہلے دن ہی ہو جاتا۔ یہ جیل میں لے نہائی تھی اس کے ہر راز سے میں واقف ہوں، مگر مجھے اپنے مالک سے بھاگنا نہیں ہے، مجھے اس کے پاس واپس جانا ہے۔ میں اور تم.... کبھی ہاتھ کام نہیں کریں گے۔ رہے تم..... تو تم اپنی مصومیت کھوتے جارہے ہو۔ تم بھی وہی بنتے جارہے ہو جن سے تم نفرت کرتے تھے۔“

”میری آفر محمد و مدت کے لئے ہے۔“ ایک استہزائیہ نظر خاور پہ ڈال کر وہ مڑ گیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پہ گارڈ کی صورت نظر آئی تو غار بے اختیار چلانے لگا۔

”مجھے ہاشم کاردار سے بات کرنی ہے۔ میری ان سے بات کرواؤ۔ کیا تم نے سنا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ سعدی باہر نکل آیا اور گونگے بھرے بنے گارڈ نے دروازہ مقفل کر دیا۔ زنجیروں میں کھڑا شخص اسی طرح چلائے جا رہا تھا۔



اس طرح لوگ اٹھ کر چلے جاتے ہیں چپ چاپ..... ہم تو یہ دھیان میں لاتے ہوئے مر جاتے ہیں کورٹ روم میں ٹھنڈ اور خنکی آج بھی موجود تھی۔ ڈریس پینٹ اور کوٹ میںلبوس احمر شفیع نے آہستہ سے دروازہ کھولا تو اندر سب کو خاموشی سے کٹہرے میں کھڑے شخص کا بیان سنتے پایا۔ وہ دبے قدموں چلتا آیا اور زمر کے ساتھ بیٹھے فارس کے دائیں جانب آ بیٹھا۔ ”سوری مجھے دیر ہوگئی۔“ معذرت خواہانہ مسکراہٹ کے ساتھ فارس کے قریب سرگوشی کی۔

فارس غازی کٹہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سفید شلوار قمیض کے اوپر براؤن کوٹ پہنے، وہ سنجیدہ اور سپاٹ نظر آ رہا تھا۔ آواز پہ گردن موڑ کر ایک گہری نظر احمر پہ ڈالی۔

”اچھا، مجھے لگاتم غلت میں ہو۔“

احمر نے بیٹھتے ہوئے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا مطلب؟“

فارس نے نگاہ اس کے پورے وجود پہ ڈالی۔ ”سلک شرٹ ڈیزائنر و اچ بدلا ہوا سیل فون اتنی جلدی اتنا کچھ احمر؟“

”میں ترقی کر رہا ہوں۔ کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“ اسے تعجب ہوا تھا۔

”تم کاردارز کے پاس کام کرنے لگے ہو وہ میرے رشتے دار ہیں، میں ان کو جانتا ہوں، اسی لئے کتنے ہفتے سے تمہیں نصیحت کر رہا ہوں کہ ان کے سرکل سے نکل آؤ، ورنہ وہ تمہیں اپنے جیسا بنالیں گے۔“

احمر کے چہرے پہ ناگواری بھری بے بسی ابھری، وہ جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر زمر نے ”شش“ کہہ کر ٹوکا تو وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ فارس سنجیدگی اور احمر ناخوشی سے سامنے دیکھنے لگا، جہاں پر اسکیوٹر، ناظم سے سوال کر رہا تھا۔

”28 اور 29 اگست کی درمیانی شب کیا ہوا تھا عدالت کو مطلع کیجئے۔“

”میں کارلے کر اس فیکٹری تک پہنچا جہاں غازی نے مجھے آنے کے لئے کہا تھا۔ وہ فیکٹری خالی، ویران اور عرصے سے بند پڑی ہے۔ میں نے کار باہر روکی، ہی تھی کہ اندر سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ میں بھاگ کر اندر آیا تو دیکھا کہ قمر الدین اسی کرسی پہ بندھا پڑا ہے جیسا صبح میں اس کو چھوڑ کر گیا تھا اور سامنے فارس غازی کھڑا ہے، اس نے پستول اس پہ تان رکھا ہے۔ قمر الدین کی گردن ایک طرف لٹکی ہوئی تھی اور غازی نے اسے کینٹن میں گولی ماری تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے اسے کیوں مارا؟ مارنا تو پلان میں شامل نہیں تھا، تو اس نے کہا کہ اس نے مجھے نازیبا باتیں کہی تھیں جن پہ مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اسے پھڑکا دیا۔ میں نے پوچھا کیسی باتیں؟ تو اس نے نہیں بتایا۔ پھر ہم سوچتے رہے کہ لاش کو کیسے ٹھکانے لگائیں۔ اس نے کہا کہ مقتول کے گھر پھینک آتے ہیں، میں ڈر گیا، مگر اس نے مجھے راضی کر لیا اور مجھے وہاں انتظار کرنے کو کہا۔ پھر وہ چلا گیا اور دو پہر کو واپس آیا۔ پھر اس نے کہا کہ لاش کو کار میں ڈالو میں نے کہا میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ اس نے خود

ہی لاش کو گھسیٹا اور گھسیٹتے ہوئے کار میں جا کر ڈالا۔ پھر ہم دونوں کار میں بیٹھ کر قمر الدین کے گھر گئے لاش بھینکی، تب ایک شخص جو اس کا بہنوئی تھا باہر کھڑا تھا۔

”کیا وہ فون پہ بات کر رہا تھا؟“ پراسکیوٹر نے کہتے ساتھ ایک نظر زمر پہ ڈالی۔

”نہیں، اس کے ہاتھ میں فون تھا مگر وہ فون پہ بات نہیں کر رہا تھا۔“ زمر خاموش رہی۔

”اچھا، یہ بتاؤ، تم فارس غازی اور مقتول کی جیل کی دشمنی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”میں قمر الدین کے رہا ہونے کے سال بعد آیا تھا جیل میں، مگر میں نے وہاں پہ اپنے ساتھیوں سے سنا تھا کہ....“

”آپ جیکشن یور آئر!“ زمر نے بیٹھے بیٹھے قلم انگلیوں میں گھماتے آواز بلند کی۔ ”heresay“

”یور آئر، فارس غازی اور قمر الدین کی دشمنی کے بارے میں کورٹ کو بتانا ضروری ہے، تاکہ پوری تصویر واضح ہو سکے۔“ پراسکیوٹر

جلدی سے بولا تھا۔

”مگر یور آئر یہ heresay ہے۔ اس نے کہا، اس سے سنا۔ آپ heresay کی ٹرائل میں اجازت نہیں دے سکتے۔ جو ناظم

صاحب ابھی کہیں گے، وہ گواہی نہیں ہے، ثبوت نہیں ہے، بلکہ سنی سنائی بات ہے، وہ صرف تب کہی جاسکتی ہے جب استغاثہ عدالت میں ان ساتھیوں کو پیش کرے جنہوں نے ناظم سے یہ بات کہی ہے، مگر چونکہ ایسا کوئی شخص استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل نہیں ہے، سو یہ سوال یا اس کا جواب.... کسی کی بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔“

”مگر یور آئر!“

جج صاحب نے ہاتھ اٹھا کر پراسکیوٹر کو روکا، پھر آنکھیں مسلتے ہوئے چند لمحوں کے لئے سوچا۔ پھر اثبات میں

بلا یا۔ ”sustained“

پراسکیوٹر نے صبر کا گھونٹ بھرا، چند ایک واجبی سوال پوچھے اور واپس آ بیٹھا۔ زمر قلم رکھ کر اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا

کٹہرے کے قریب آئی۔ ناظم خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”آپ کو انگریزی آتی ہے؟“ سنجیدگی سے سوال کیا۔ ناظم نے ایک نظر پیچھے بیٹھے پراسکیوٹر کو دیکھا، اور پھر زمر کو۔ ”ہی

تھوڑی بہت۔“

”Dying declaration“ کیا ہوتا ہے؟ عدالت کو بتائیں گے؟“

”آ....“ اس نے تذبذب سے شانے اچکائے۔

”او کے میں بتاتی ہوں Dying declaration نزعی بیان کو کہتے ہیں، جو کوئی شخص مرتے وقت دیتا ہے، اور....“

”آپ جیکشن یور آئر۔ مسز زمر مد ع سے باہر جا رہی ہیں۔“ پراسکیوٹر جلدی سے کھڑا ہوا۔

”اوور رولڈ۔ ان کی پوری بات سننے میں کیا حرج ہے۔“ جج صاحب نے زمر کو ایک حوصلہ افزاء نظر سے نوازا۔ وہ واپس ناظم کی

طرف گھومی۔

”آپ نے کیا اس کیس کا نام سن رکھا ہے، اشرف پرویز بنام سلیم شاہد؟“

”جی!“

”اس کیس میں سلیم شاہد پہ الزام تھا کہ اس نے ایک شخص کو سڑک پہ چھرا مار کر قتل کیا ہے، اور مقتول نے مرنے سے پہلے ایک راول

نزعی حالت میں بتایا تھا کہ اس کا قاتل سلیم شاہد ہے اور یہ کہ اس نے خاندانی عداوت کی بنا پہ ایسا کیا ہے۔ اس راولگیر کا نام....“ نیز۔

کاغذاٹھا کر لائی اور ناظم کی طرف بڑھایا۔ ”مجھے پڑھ کر سنائیں۔“

ناظم نے ایک نظر کاغذ پہ ڈالی۔ ”ناظم فاروق ولد محمد فاروق۔“

”سو ناظم صاحب کیا آپ اس کیس میں بطور گواہ پیش ہوئے تھے اور آپ نے مقتول کا Dying declaration عدالت کو

سنایا تھا؟“

”جی ہاں۔“

”مگر عدالت نے ملزم سلیم شاہد کو بری کر دیا تھا۔ کیا آپ مجھے اسی کاغذ پہ ہائی لائٹ شدہ سطور اونچی آواز میں پڑھ کر سنائیں گے

جس میں جسٹس نعیم الحق نے اس نزعی بیان پہ یقین نہ کرنے کی وجہ بیان کی ہے؟“

وہ انگریزی میں سطور پڑھنے لگا۔ سب خاموشی سے سننے لگے۔

”دوران جرح یہ ظاہر ہوتا ہے کہ PW5 ناظم فاروق نے چند باتوں میں غلط بیانی سے کام لیا ہے، اس کے علاوہ PW5 ناظم

فاروق کی کریڈیبلٹی اور سابقہ ریکارڈ ایسا صاف شفاف اور شک و شبہ سے پاک نہیں ہے اس لئے ان کی بات پہ یقین نہیں کیا جاسکتا۔“ پڑھ

کر وہ خاموش ہو گیا۔

”جو شخص ایک معاملے میں جھوٹ بول سکتا ہے، اس کی بات پہ کسی دوسرے معاملے میں یقین نہیں کیا جاسکتا۔ یہ الفاظ جسٹس محمد

عامر ملک نے 1990 میں صابر بنام سرکار اپیل کیس کے دوران کہے تھے اور ان الفاظ کی روشنی میں، کیا ہم آپ کی بات پہ یقین کریں، ناظم

صاحب؟“

”یور آئر، مسز زمر ایک اور کیس کو اس کیس کے ساتھ ملا کر گواہ کی کریڈیبلٹی کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کر رہی ہیں۔“ اس نے پھر

اجتاج کیا۔ زمر نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

”اوکے فائن۔ مجھے گواہ کی کریڈیبلٹی کو چیک کرنے دیں۔“ دوبارہ سے ناظم کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔

”آپ کتنی دفعہ جیل جا چکے ہیں؟“ (اس سوال پہ پراسیکیوٹر نے پھر سے پہلو بدلا تھا۔)

”دو دفعہ۔“

”کیا یہ درست ہے کہ آپ کے اوپر چوری اور اغوا برائے تاوان کے پانچ مقدمے مختلف اوقات میں قائم ہو چکے ہیں؟“

”جی۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ زمر نے جج صاحب کو ان الفاظ کو جذب کرنے کے لیے چند لمحے کا وقفہ دیا پھر بولی۔

”اس رات آپ جب فیکٹری پہنچے تو آپ نے گن فائر کب سنا؟“

”جب میں نے کار پارک کی۔“

”اور پھر آپ دوڑ کر اندر آئے تو کیا دیکھا؟“

”یہی کہ فارس غازی نے گن مقتول پہ تانی ہوئی ہے۔ اور مقتول کی کپٹی سے خون بہہ رہا ہے۔“

”کیا فارس غازی اس کو دوسری گولی مارنا چاہتا تھا؟“

”آب بجکشن یور آئر، کاؤنسر گواہ سے اس کی رائے مانگ رہی ہیں۔“ وہ پھر پیچھے سے بولا۔ جج نے ”sustained“ بولا ہی تھا

ایڈمر فوراً سے کہنے لگی۔

”اوکے“ میں سوال کو rephrase کرتی ہوں۔ کیا آپ نے غازی کو دوسری گولی چلانے سے روکا؟“

”نہیں، وہ دوسری گولی نہیں چلا رہا تھا، اس نے مجھے دیکھ کر گن نیچے کر لی۔“

”او کے!“ وہ وائٹ بورڈ کی طرف آئی، ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”اس مقام پہ آپ نے کار پارک کی، اور اس مقام پہ فارس غازی لے آپ کے بقول گولی چلائی۔ میں چند روز پہلے اپنے بھتیجے کے ساتھ اس جگہ پہ گئی، اور اس نے مجھے پوائنٹ اے سے پوائنٹ بی تک بھاگ کر دکھایا۔ سو اس پارکنگ کی جگہ سے اس اندرونی کمرے تک بھاگ بھاگ کر بھی آتے اس کو ڈیڑھ منٹ لگا۔ آپ کو بھی اتنا ہی وقت لگنا چاہیے۔ مجھے صرف اتنا سمجھائیں کہ گولی چلانے کے بعد ڈیڑھ منٹ تک ایک آدمی، جس کا ارادہ بقول آپ کے دوسری گولی چلانے کا بھی نہیں تھا، کیوں اپنے مقتول پہ پستول تانے رکھے گا۔ عموماً گولی چلانے کے بعد پستول جھٹکا کھاتا ہے اور لوگ پستول والا ہاتھ نیچے گرا دیا کرتے ہیں۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں، میں نے جو دیکھا وہ بتا دیا۔“ اس نے ڈھٹائی سے شانے اچکائے۔ زمر نے ایک نظر جج صاحب کے تاثرات پہ ڈالی، جو کاغذ پہ کچھ لکھ رہے تھے پھر دوبارہ ناظم کی طرف گھومی۔

”اچھا، مجھے ذراری فریش کرنے دیں۔ غازی مبینہ طور پہ لاش کو کس طرح کا ریتک لے کر آیا؟“

”گھسٹ کر۔“

”فیس اپ یا فیس ڈاؤن؟“

”جی؟“

”لاش کا چہرہ اوپر تھا یا زمین کی طرف تھا؟“

”آ... اوپر تھا۔“

”جوراستہ آپ نے پولیس کو بتایا تھا جہاں مقتول کے خون کے دھبے بھی ملے ہیں، وہ پتھر بلا بھی ہے اور درمیان میں کافی گھاس بھی جیسا کہ آپ ان تصاویر میں دیکھ سکتے ہیں۔“ اس نے اپنی میز سے چند تصاویر اٹھا کر باری باری جج صاحب اور پھر نیچے پراسیکیوٹر کی مہر رکھیں۔

”اس لحاظ سے جب کسی شخص کو ایسی زمین پہ گھسیٹا جائے تو اس کی کمر پہ رگڑ کے نشان یا کپڑوں کا پھٹنا یا سبز مائل دھبے ہونا ناگزیر ہوتا ہے، مگر میڈیکولیکورپورٹ کے مطابق مقتول کے جسم پہ ایسا کوئی نشان نہیں تھا۔“ پراسیکیوٹر کھڑا ہونے لگا مگر وہ اونچی آواز میں بولے کی ”اور اس سے پہلے کہ پراسیکیوٹر صاحب اعتراض کریں 1990 میں جسٹس عامر ملک نے سردار لطیف کھوسہ کے کلائٹ صابر وغیرہ کی اہل اس لئے منظور کی تھی کہ اگر اس نے مبینہ طور پہ لاش کو گھسیٹا تھا تو لاش پہ سبزی مائل دھبے یا رگڑ کے نشان کیوں نہیں تھے؟ اس جج منٹ کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ ناظم صاحب کے بیان میں جھول ہے۔ اور لاش کو دو لوگوں نے اٹھا کر کار میں ڈالا تھا، اور وہ دو لوگ شریک جرم تھے۔“

”او کے اب کاؤنٹر testify کر رہی ہیں۔“ زمر اسے نظر انداز کیے جج صاحب کے سامنے آکر بولی۔

”یور آنر مجھے مزید کوئی سوال نہیں کرنا لیکن میں گواہ کو روری کر اس کرنے کا حق محفوظ رکھنا چاہتی ہوں۔“ (پراسیکیوٹر کے تاثرات پہ چینی سے بگڑے) اور یور آنر اگر اس دوران ناظم صاحب جیل توڑ کر کسی دوسرے ملک فرار ہو گئے تو عدالت کو ان کی گواہی خارج کرنی ہوگی، پراسیکیوٹر صاحب کو اس گواہ کو give up کرنا پڑے گا۔ اب وہ دونوں ایک ساتھ بولنے لگے تھے اور درمیان میں جج صاحب بھی ناواہی سے کچھ کہے جا رہے تھے۔

فارس نے ایسے میں مڑ کر احمر کو دیکھا جو کسی سوچ میں گم لگتا تھا۔

”میں پھر کہہ رہا ہوں، کاردارز کی جاب چھوڑ دو۔ خاور کے ہوتے ہوئے وہ کسی دوسرے کو اپنا رائٹ ہینڈ نہیں بنائیں گے۔“

”خادر نہیں ہے اب۔“ وہ ہلکا سا بولا تو فارس نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔

”کیوں کدھر گیا وہ؟“ وہ تیزی سے سیدھا ہوا۔

”معلوم نہیں۔ نوکری سے نکال دیا ہے اسے یا خود ہی کہیں روپوش ہو گیا ہے۔“ احمر سامنے دیکھنے لگا۔ فارس نے ہونٹ سکڑ کر سانس خارج کی اور واپس پیچھے کو ہوا۔

”کچھ معلوم ہے کیوں؟ وہ تو ان کا قابل اعتبار آدمی تھا۔“ سرسری سا پوچھا۔

”نو آئیڈیا۔“ احمر نے شانے اچکائے۔ ایک مسکراہٹ فارس کے لبوں پہ ابھر کر معدوم ہوئی۔ اتنے دن بعد سکون کا سانس نصیب ہوا تھا اسے۔ ایک نظر پر اسکیوٹری طرف دیکھا جو عدالت برخواست ہونے پہ اب موبائل پہ کوئی نمبر ملتا تیزی سے باہر نکل رہا تھا۔ (کوشش کرتے رہو۔ مگر تمہیں پیسے دینے والا فون نہیں اٹھائے گا۔) وہ جب اٹھا تو مسکرا رہا تھا۔ (احمر کچھ کہے بنا باہر نکل گیا تھا۔) زمر نے اپنی چیزیں سیٹھے چونک کر اسے مسکراتے دیکھا۔ پھر آنکھیں سکیڑیں۔

”ایسا کیا ہوا ہے جو میں نہیں جانتی؟“

”ارے نہیں، میں یہ سوچ رہا تھا کہ ناظم کی طرف سے پریشان نہ ہو، وہ جیل سے نہیں بھاگے گا۔“

”تمہیں کیسے پتہ؟“

”میں دیکھ لوں گا س معاملے کو۔“

”بالکل نہیں۔“ قلم اٹھا کر سختی سے تنبیہ کی۔ ”تم کسی معاملے کو نہیں دیکھو گے۔ اور اگر تم نے کسی کو پھر جیل میں مارا پیٹا تو اچھا نہیں ہو گا۔“

”تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ صبر اور تحمل سے اس کے سامنے کھڑے اس نے پوچھا تھا۔

”اول، تم بالکل آرام اور سکون سے جیل میں رہو، کچھ نہ کرو، کچھ بھی نہیں۔ صرف ایک شریف آدمی بن کر رہو۔ اور دوم۔ تم مجھے آپ

کہا کرو۔“ اسے گھور کر وہ پلٹی تھی کہ وہ اسی تابعداری سے بولا تھا۔

”جو تم کہو!“ زمر کے توبر پہ لگی تلووں پہ بجھی۔ ایڑھیوں پہ تیزی سے گھومی۔

”تمہیں پتہ ہے فارس اگر مجھ پہ ایک قتل معاف ہوتا تو کس کو گولی مارتی؟“

”مجھے پتہ ہے۔“ وہ مسکرا کر ہلکا سا اس کی طرف جھکا۔ ”تم خود کشی کرتی۔“ اور ایک طرف سے نکل کر سپاہیوں کی طرف بڑھ گیا جو

اسے لینے آرہے تھے۔

اُف۔ اس نے کلس کر ڈھیروں غصہ اندر اتارا تھا۔



ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہنس..... جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

یہ شاید اگلی رات کا قصہ ہے۔ اندھیرے اور دھند میں ڈوبی انیکسی کی عمارت خاموش پڑی تھی۔ کچن میں دودھ ایلنے رکھا تھا، اور حنین چولہے کے آس پاس شہتی موبائل اسکرین پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ لمبا سویٹر پہنے پیروں میں مختلف رنگ کی جرابیں جن سے انگوٹھے برہنہ ہو کر نکل رہے تھے، اور بالوں کو گول مول باندھے وہ ایک بے ترتیب اور بھرے بھرے کچن کے اندر کھڑی تھی۔ سارے برتن دھلے تھے، مگر پھر بھی کچھ صاف نہ لگتا تھا۔ نجانے کیوں؟

اسکرین کو دیکھتے اس کی آنکھیں پھیلیں۔ انگوٹھے اور انگلی سے اس سطر کو زوم کر کے بڑا کیا۔ بار بار پڑھا۔ ”نوشیرواں کاردار اور علیشا

ریکا کاردار اب دوست ہیں؟“ فیس بک کی ایک پبلک سی اطلاع کو وہ بار بار پڑھ رہی تھی۔ ہاشم کی پروفائل وزٹ کرنا چھوڑ چکی تھی، مگر باقی

کاردار زکوہ کبھی دیکھ ہی لیتی تھی۔

”مگر یہ دونوں دوست کیسے بن گئے؟“ اس نے دانتوں کے درمیان انگلی دبا کر سوچا۔ اچنبھاسا اچنبھاتھا۔ دل میں کھد بد ہوئی۔
 ”آج ہی تو فیو نانا نے بتایا تھا کہ خادراب یہاں جاب نہیں کرتا، یعنی اگر میں اس پر ہیرو.... مطلب سپر لو زری کی پرو فائل ہیک کروں تو کسی کو نہیں پتہ چلے گا۔“ آنکھیں چمکیں اور اس سے پہلے کہ وہ ایکسائیٹڈ ہو کر لیپ ٹاپ اٹھانے بھاگتی.... سس کی آواز کے ساتھ.... دودھ ابل کر چو لہے پہ جاگرا۔

”اللہ میرے!“ وہ دہل کر پلٹی اور جلدی سے چولہا بند کیا۔ ”پورے بیس منٹ میں ادھر کھڑی رہی، مگر نہیں تب نہیں ابلتا تھا اسے، اور ایک منٹ کے لئے فون اٹھایا تو یہ گر گیا؟ میں کدھر جاؤں؟“ ڈوٹی زور سے کاؤنٹر پہ پٹخ کر وہ رونے والی ہو رہی تھی۔ دفعتاً چوکھٹ میں زمر نمودار ہوئی۔ وہ اپنے لئے چائے بنانے آئی تھی شاید۔

”کیا ہوا؟“ اندر آتے تعجب سے اس کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”حادثہ ہوا، قیامت ہوئی!“ وہ آنکھوں میں آنسو لئے غم اور غصے سے پلٹی۔

”میں..... میں حنین یوسف.... اب دس منٹ یہاں کھڑی ہو کر چولہا صاف کروں گی۔ اور پھر یہ فرش بھی۔ اس روز کتابیں لیں پڑھنے کے لئے، پینٹ خرید، تصویریں بنانے کے لئے، کہ آنکھ اور دل کو کیسے مصروف کروں مگر پڑھنے لگی تو فوکس نہیں ہوا۔ پینٹ کرنے لگی تو رنگ ہی ادھر ادھر بننے لگے۔ اچھا ٹھیک ہے، نہ مجھے پڑھنے کا شوق ہے نہ آرتھک ہوں۔ مجھے تو انجینئر بننا تھا، وہ بھی نہ بن سکی۔ ایم اے بھی نہیں کیا میں نے۔ آپ بتائیں، کیا میں اتنی جیننس لڑکی اس قابل تھی کہ یوں گھر میں ضائع ہوں؟ مجھے تو کمپیوٹر ہیکر بننا تھا، آئی ٹی ایکسپٹ، بڑے بڑے algorithms لکھنے تھے۔ مجھے تو نولن روس، Huck اور Felicity Smoak کی طرح انگلیاں کھٹ کھٹ کر کے کمپیوٹر کی دنیا پہ حکمرانی کرنی تھی۔ اور کر کیا رہی ہوں میں؟“ دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر غصے اور آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بولے جا رہی تھی۔ ”میں یہاں پہ برتن دھو رہی ہوں، چولہوں کی گرل مانجھ رہی ہوں، ہاتھ روم صاف کر رہی ہوں، فرش اسکرپ کر رہی ہوں۔ جھاڑو اور ٹاٹ لگا رہی ہوں۔ ارے نوکرائیاں کرتی ہیں یہ کام! وہ پتی درتاقسم کی بیویاں جن کے پاس دنیا کا کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا، نہ ٹیلنٹ ہوتا ہے، نہ ذہن ہوتا ہے، وہ کرتی ہیں ایسے کام۔ اور انی نے مجھے..... مجھے ان کاموں پہ لگا دیا ہے!“ وہ صدمے میں تھی۔ زمر خمل سے سنتی رہی۔

”آئی ایم ڈن!“ دونوں ہاتھ اٹھا کر جیسے اعلان کیا۔ ”بہت بن چکی میں ماسی۔ نہیں کرنے مجھے فارغ عورتوں والے کام۔“ پیر پٹخ کر آنسو پونچھتی، وہ دھپ دھپ لاؤنج کی طرف بڑھ گئی اور زمر، جس نے یہ ساری تقریر خاموشی سے سنی تھی، بس ہلکی سی سانس لے کر بولی۔ ”تو پھر اپنا وائس ایپ اسٹیٹس بھی بدل دو۔“

پیمنٹ کی طرف جاتی حنین رکی۔ مڑ کر بیٹگی آنکھوں میں تعجب بھرے اسے دیکھا۔ ”کیوں؟“

”کیونکہ جو آیت تم نے لگا رکھی ہے، و اوحی ربک الی المنحل، مجھے اس کا مطلب معلوم ہے۔“ وہ نرمی سے کہتی، آستین موڑے چائے کی کیتلی چو لہے پہ رکھنے لگی۔

”آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟“

”یہی کہ.... سعدی کو اس آیت کے بارے میں بہت سے فلسفے آتے ہوں گے، مگر مجھے اس کا ایک ہی مطلب معلوم ہے۔ سادہ اور آسان سا مطلب کہ اللہ نے وحی کی شہد کی مکھی کی طرف، اور اسے کہا کہ وہ اپنا ”گھر“ بنائے.... اور.... وہ پھولوں پھولوں سے رس چوسے یا آسان راستوں پہ چلے، وہ یہ سب اس لئے کرتی ہے تاکہ اپنے گھر واپس آ سکے، اور اپنے گھر کو ٹیٹھے اور خوبصورت رنگوں سے بھر سکے۔ اور پھر اس ساری محنت کا جو نتیجہ نکلے گا، اس میں.... صرف اس میں شفا ہوگی.... تمہارے دل کی۔ کیونکہ دنیا کا سب سے زیادہ شفا بخش مشروب اس گھر میں بنتا ہے جو شہد کی مکھی کا گھر ہے۔ سب سے خوبصورت، سب سے زیادہ آرگنائزڈ۔ لیکن آف کورس.....“ اس نے شانے اچکائے۔ ”یہ تو

ماسیوں، کم ذہن ہاؤس وانقر والے فضول کام ہیں، سو تم اپنی شفا کتابوں اور پیٹنٹنگز اور کمپیوٹرز میں ڈھونڈو.... ویسے بھی کل صداقت پلس فیملی آ جائے گا واپس سو... تم پریشان نہیں ہو اور جا کر سو جاؤ!“ کسی بھی ناراضی کے بغیر وہ اب مصروف سی دودھ کیتلی میں انڈیل رہی تھی۔
حنین ایک دم بالکل متحیر اور ساکت کھڑی رہ گئی۔

زمر اسے چھوڑ کر چائے بنا کر اوپر آئی۔ اسامہ ندرت والے کمرے میں ٹیب لئے بیٹھا کوئی گیم کھیل رہا تھا (اس کا چارجر صرف اس کمرے کے سوئچ میں چلتا تھا) سو وہ اب اکیلی بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے، کبل میں لپٹی، گھٹنوں پہ فائل رکھے، چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔ کپ ابھی آدھا ہوا تھا کہ موبائل بجا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ غیر شناسا نمبر۔ کان سے لگا کر مصروف اور محتاط سا ”ہیلو؟“ کیا۔
”السلام وعلیکم مسز زمر!“ وہ مسکرا کر خوشگوار سے انداز میں بولا تھا تو زمر نے بے اختیار نگ سائیڈ پہ رکھا اور سیدھی ہوئی۔ بھوری آنکھوں میں حیرت ابھری۔

”ڈونٹ ٹیل می تم جیل تو ذکر فرار ہو گئے ہو۔ اور اگر نہیں تو سیل فون کہاں سے ملا؟“
”ڈونٹ ٹیل می کہ تمہیں نہیں پتہ یہاں کیا کیا مل جاتا ہے۔“ وہ رات کے اس پہر ایک تنہا پڑی کوٹھڑی میں سلاخوں پہ ایک ہاتھ رکھے کھڑا دوسرے سے موبائل کان سے لگائے، مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ قدرے فاصلے پہ محتاط سا پولیس اہلکار ادھر ادھر دیکھتا پہرہ دے رہا تھا۔
”اچھا اور کیا مل جاتا ہے؟“ اس نے مسکرا کر فائل پرے رکھی اور ایک انگلی پہ عادتاً ٹھنگریالی لٹ پلٹتے گویا ہوئی۔
”تم سن کر جلیس ہوگی۔“

”آہ میرا اسٹینڈرڈ اتنا نہیں گرا کہ میں جیل میں خفیہ طور پہ لائی جانے والی لڑکیوں سے جلیس ہوں۔ ویسے کوئی خاص کام تھا کیا جو تم اپنی کسی دوست کو چھوڑ کر مجھے فون کر رہے ہو؟“

”استغفر اللہ۔ مذاق کر رہا تھا۔“ وہ خفا ہوا۔
”میں سیرکس تھی!“ لٹ انگلی پہ لپٹتے اس نے شانے اچکائے۔
”اچھا کام تو کوئی نہیں تھا۔ یونہی خیریت پوچھنا چاہ رہا تھا۔“
”ہم ٹھیک ہیں، مزے میں ہیں۔“ پھر وہ ذرا اداس ہوئی۔ ”سعدی نہیں ہے بس!“
وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا۔ ”ایک زمانے میں میں اسی طرح سعدی کو کال کیا کرتا تھا۔“ کچھ یاد کر کے اداسی سے مسکرایا۔
”تم ہمیشہ سے ایک دو نمبر انسان تھے۔“

وہ ہلکا سا ہنسا۔ زمر کچھ کہنے لگی مگر کھٹکا ہوا۔ وہ چونکی۔ کھڑکی کے باہر بالکونی کی جتنی جل رہی تھی، وہاں کوئی سایہ سا تھا۔
”آ...“ وہ گردن اونچی کر کے دیکھنے لگی۔ فارس بھی ٹھہرا۔ ”کیا ہوا؟“

”بالکونی میں کوئی ہے۔“ وہ ذرا آگے کو ہوئی تو دیکھا، وہ ہاشم کا کتا تھا جو غالباً بالکونی کی بیرونی سیڑھیاں چڑھ کر وہاں آ بیٹھا تھا۔ وہ پرسکون سی ہو کر واپس ٹیک لگاتی بتانے ہی لگی تھی کہ.....

”کیا مطلب؟ کون ہے باہر؟ تم اکیلی ہو؟ باقی سب کہاں ہیں؟“ وہ ایک دم اتنی تیزی اور پریشانی سے بولا تھا کہ زمر کہتے کہتے رک گئی۔ پھر اس کی آنکھیں چمکیں۔ مسکراہٹ دبائے ذرا دیر کورکی۔ ”ہاں... میں اکیلی ہی ہوں... لیکن... معلوم نہیں کون ہے۔ کوئی سایہ ہی ہے....“

”کدھر ہے؟ تمہیں وہ نظر آ رہا ہے؟ کھڑکی بند ہے؟“
”ہاں... اب نظر آ رہا ہے۔“ رک رک کر فکر مندی سے بتانے لگی۔ ”لباسا، سانولا سا۔ کلرڈ آنکھیں ہیں۔“

”کھڑکی بند ہے؟“ وہ تیزی سے بولا تھا۔

اس نے کھڑکی کی بند کھنڈی کو دیکھا۔ ”نہیں تو۔“ اسی فکر مندی سے سر ہلایا۔

”رات کے اس وقت کھڑکیاں دروازے کھول کر بیٹھے ہو تم لوگ؟“

کتا اب شیشے پہ پنچے مارنے لگا تھا۔ وہ تنہائی کا شکار لگتا تھا۔

”فارس.... اب وہ کھڑکی پہ کچھ مار رہا ہے۔“

اور جیل میں قید فارس غازی کو ایک دم سر چکراتا محسوس ہوا تھا۔ غصے بے بسی۔ اس کا دماغ سنسناتا اٹھا تھا۔ ”تم فوراً اس کمرے سے نکلو“

اور نیچے اپنے ابو کے کمرے میں جاؤ۔ جنین، اسامہ کو بھی وہیں بلاؤ اور کمرہ لاک کر لو فوراً۔ پھر پولیس کو کال کرو بلکہ میں ایک نمبر دیتا ہوں، ادھر

کال کرو۔ اور ہاں.... دروازے میں میری گن ہوگی، اسے نکالو۔ زمر تم میری بات سن رہی ہو۔“ وہ اتنا پریشان تھا اور وہ کچھ بول ہی نہیں رہی تھی۔

”میں نہیں باہر جا رہی، میں کوئی ڈرتی تھوڑی ہوں۔“ مسکراہٹ دبا کر آواز کو بخنیدہ رکھے بولی۔

”زمر میں کہہ رہا ہوں کمرے سے نکلو!“ وہ غصے سے بولا تھا۔ باہر کھڑے اہلکار نے اسے اشارہ کیا مگر اس وقت وہ کچھ اور نہیں سن پا

رہا تھا۔ وہ اپنے خاندان کو کاردارز کے اتنا قریب چھوڑ آیا تھا.... وہ کیا کرے؟

”میں کیوں نکلوں؟ میں یہی سب کچھ ڈیز رو کرتی ہوں نا۔ تم نے کہا تھا نا اس رات ریسٹورانٹ میں..... کہ تم مجھے اس طرح دیکھنا

چاہتے

ہو..... اور.....“

”میں لعنت بھیجتا ہوں اس رات پہ اور.....“ وہ دبا دبا سا چلایا تھا مگر اسی لمحے اسامہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور ایک دم حیرت

سے بولا۔ ”پھپھو.... یہ ہاشم بھائی کا کتا۔ یہاں کیا کر رہا ہے؟“

زمر نے گڑبڑا کر اس کو دیکھا اور پھر فون کو۔ دوسری طرف وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہوا تھا۔ زمر نے (اُف) آنکھیں میچ لیں۔

”سیم کیا کہہ رہا ہے؟“ وہ ذرا رک کر بولا۔

”پپ.... پتہ نہیں....“ خفت سے بولی اور ساتھ ہی غصے اور خفگی سے اسامہ کو گھورا۔

فارس نے ایک طویل سانس کھینچی۔ تنے اعصاب ڈھیلے کیے۔

”باہر.... کتا ہے؟ صرف کتا؟“ ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔

”مجھے نہیں پتہ۔ اسامہ!“ فون غصے سے اس کی طرف بڑھایا۔ ”ماموں کا فون ہے۔ بات کرو۔“

”ہیں سچی؟“ وہ خوشی سے آگے بڑھا، پھر فون لیتے ہوئے زمر کے تاثرات دیکھ کر مسکراہٹ سمٹی۔ ”میں نے کیا کیا ہے؟“

وہ خفگی سے کچھ بڑبڑا کر کبل تانے لیٹ گئی۔ اسامہ نے حیرت سے فون کان سے لگایا۔

”ماموں؟“

”ذرا اپنی پھپھو کو فون دو!“ اسے شدید تاؤ آیا تھا۔

اتنی آواز تو زمر کو بھی سنائی دی تھی، جہی کروٹ کیے بولی۔ ”میں سو گئی ہوں۔“

”وہ کہہ رہی ہیں وہ سو گئی ہیں۔“ اس نے اطلاع دی پھر پر جوش سابات کرنے لگا۔ ”آپ کیسے ہیں؟ ہم آپ کو بہت مس کرتے

ہیں۔ جنہ.... جنہ....“ ساتھ ہی آواز دیتا ہوا نیچے بھاگا تھا۔

”اُف۔“ آنکھیں موندے وہ سخت خفا تھی۔

فون کس نے سنا، کب بند ہوا، کچھ معلوم نہیں۔ جنین اس کے ساتھ آکر لیٹی تو اس نے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔ حنہ اداسی سے بند فون اس کے ساتھ رکھ رہی تھی۔

”سوری، میں کچھ زیادہ ہی بول گئی۔“ وہ چپ لیٹی آزرگی سے چھت کو دیکھتے کہہ رہی تھی۔ ”ایسے موقعوں پہ بھائی بہت یاد آتا ہے۔ اگر وہ ہوتا تو ایسے آسان لفظوں میں میرے ہر مسئلے کا حل بتا کر مجھے پرسکون کر دیتا۔ پتہ ہے.....“ پکا سامنی۔ ”کبھی کبھی کہتا تھا، حنہ کبھی مجھے بہت سا وقت ملے تو میں ایک کتاب لکھوں گا قرآن پہ۔ میں نے پوچھا، تفسیر لکھو گے؟ کہتا، میں کیسے تفسیر لکھ سکتا ہوں؟ بہت تفاسیر موجود ہیں پہلے سے ہی۔ میں صرف قرآن پہ غور و فکر کر کے آیات سے ملنے والے اسباق کو لکھنا چاہوں گا، کہ میں نے اس آیت سے کیا سیکھا، کیا سمجھا۔ میں اسے ڈراتی تھی، کہ بھائی، فتوے لگ جائیں گے، لوگ کہیں گے آپ کو قرآن پہ کچھ لکھنے کی اجازت کس نے دی؟ اہلیت کیا ہے آپ کی۔ تو وہ ہنس کر کہتا، ان لوگوں سے کہنا، حنہ، مجھے نہ ان کی اجازت کی ضرورت ہے، نہ مجھے ان کے فتووں سے فرق پڑتا ہے۔ مجھے قرآن پہ غور و فکر کرنے کا حق اللہ نے دیا ہے، مجھے نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی تاکید اللہ نے کی ہے۔ کوئی پیر، کوئی عالم، کوئی پروفیسر مجھ سے یہ حق نہیں چھین سکتا۔ میں اہل قرآن ہوں۔ ہم اللہ کا کنبہ ہیں۔ ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ ہم تو بھی ڈنکے کی چوٹ پہ قرآن عام لوگوں تک، عام ہاتھوں تک پھیلائیں گے عام اور سادہ زبان میں۔ ہاں جس دن ہمارے اونچی دستاروں والے اور لمبے ناموں والے معزز علماء کرام، جس دن وہ گاڑھی اردو اور مشکل اصطلاحات میں بیان دینا اور کتابیں لکھنا چھوڑ دیں گے، اس دن میرے کچھ بھی لکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن جب تک وہ قرآن کو عام نہیں کریں گے، میں تو ایسا کچھ ضرور لکھوں گا۔ کیونکہ جس نے مجھے سکھایا ہے، مجھے اس علم کا حق ادا کرنا ہے نہیں تو میری پوچھ دوسروں سے زیادہ ہو گی۔“

”تم یہ سب کیوں کہہ رہی ہو؟“

”کیونکہ جب ہم چھوٹے تھے تو سنتے تھے، حافظ قرآن کے والدین کے سر پہ قیامت کے دن سونے کا تاج پہنایا جائے گا۔ بات یہ ہے زمر، کہ اس تاج کے لیے ہم اپنے بچوں کو قرآن تو یاد کروادیتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ تاج بہت بھاری ہے۔“

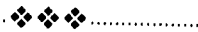
”جنین.....“ اس کا دل دکھا، ایک دم اٹھنے لگی مگر حنہ نے کروٹ بدل لی۔

”ابھی مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ مجھے فی الحال مدد کی ضرورت ہے، مگر نہ آپ سے، نہ بھائی سے، نہ ہی کتاب والے شیخ سے۔ مجھے ان کی مدد چاہیے جنہوں نے میرے سر پہ یہ تاج رکھا تھا۔ مجھے ان کو ڈھونڈنا ہے۔“ کروٹ لیے، اس کی آواز نم ہو گئی۔ زمر خاموشی سے واپس لیٹ گئی۔

اور دور..... سمندر پار..... کمرہء بحن میں زنجیروں میں جکڑے قیدی کے سامنے، رئیس پنجوں کے بل بیٹھا چند تصاویر زمین پہ رکھ رہا تھا۔

”یہ تمہارا بیٹا ہے“ اور یہ تمہاری بیوی اور ماں۔ ان کو خاور صرف ای میل کر کے ایک نامعلوم مقام پہ ایک نامعلوم گھر میں شفٹ ہونے کے لئے کہتا ہے اور کل وہ شفٹ ہو بھی گئے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا وہ کہاں ہیں، سوائے ہاشم کا ردار کے۔ تم ان کی خیریت چاہتے ہو تو اعتراف جرم کر لو ورنہ ہم سے اب کچھ بعید نہیں۔“

وہ کہہ رہا تھا اور خاور خاموش مگر سرخ انگارہ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔



میں جان بوجھ کر انجان بن رہا ہوں اگر..... معاملات میں مجھ سے نہ ہو شیاری کر! کمرہ ملاقات خالی تھا سوائے اس وجیہہ اور مصروف ملاقاتی کے جو میز کے پار بیٹھا، ٹانگ پہ ٹانگ بجائے بار بار کلائی پہ بندھی قیمتی

گھڑی دیکھ رہا تھا۔ پورے کمرے میں اس کے پرفیوم کی مہک رچ بس گئی تھی۔

فارس غازی جو کھٹ پہ نمودار ہوا، تو بے زار بیٹھے ہاشم نے نگاہیں اٹھائیں، پھر خود بھی کھڑا ہوا۔ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ”ہیلو فارس!“

”تمہارا شکریہ کہ تمہیں بالآخر میرا پیغام مل گیا۔“ وہ ازلی بے نیاز انداز میں کہتا اس سے ہاتھ ملا کر کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ ہاشم بھی کوٹ کا بٹن کھولتے ہوئے سامنے بیٹھا۔

”ہاں“ میں مصروف تھا۔ زمر سے تمہاری خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔“ ذرا توقف کیا۔ ”سوری پہلے نہیں آسکا!“ ہلکے سے ابرو اچکائے۔ فارس نے جواباً ناک سے کبھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ ملایا۔

”میں نے خاور کو دو تین دفعہ پیغام بھیج دیا تھا، کوئی دو ماہ پہلے، مسئلے کی نوعیت سے بھی آگاہ کیا تھا، کیا اس نے نہیں بتایا؟“ دونوں ہاتھ میز پر رکھے آگے ہو کر بیٹھے، فارس نے سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔

ہاشم اس کے برعکس ٹیک لگا کر ایک بازو کرسی کی پشت پہ پھیلائے بیٹھا تھا، ہلکے سے کندھے اچکائے۔ ”اس نے بتایا تھا، میرے ہی ذہن سے نکل گیا۔ کہو کیا بات تھی؟ کوئی فاضل پرابلم.....“

”اؤںہوں۔“ وہ رکا۔ پھر ہاشم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ”دو ماہ پہلے..... عدالت میں..... میرے پاس الیاس فاطمی آیا تھا۔“

”کون الیاس فاطمی؟“ ہاشم نے لاعلمی سے ابرو اٹھایا۔ البتہ فارس نے دیکھا، کرسی کی پشت پہ پھیلے اس کے ہاتھ کی انگلیاں اندر کو مڑیں۔ یعنی کہ وہ چونکا تھا مگر چہرے سے ظاہر نہیں تھا۔

”وارث کا باس۔ جس پہ مجھے شک تھا کہ اس نے وارث کو مروایا ہے۔“

”اوہ یس یس! فاطمی۔ نیب ڈائریکٹر۔ آئی سی۔ تو کیا تمہاری اس سے بات ہوئی؟“ عام سے لہجے میں سوال کیا۔

”ہاں۔ کچھ دیر کے لئے۔ اس نے کہا کہ وہ میرے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہے۔ کیونکہ اسے ڈر ہے کہ میں باری باری اپنے ہر دشمن سے انتقام لے رہا ہوں۔ سو وہ نہیں چاہتا کہ اس کی باری بھی آئے۔“

”اسے اچانک سے تم سے خوف کیوں محسوس ہونے لگا ہے؟“

”ہاشم!“ وہ قدرے قریب ہوا۔ ”میں تمہیں بالکل پسند نہیں کرتا، نہ تم مجھے پسند کرتے ہو، مگر چونکہ یہ بات اس کو معلوم ہو چکی ہے، تو تمہیں بھی بتادیتا ہوں۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”ڈاکٹر ایمین میری سائیکا ٹرسٹ تھی اس نے کورٹ میں میرے خلاف گواہی دی تھی۔ میں نے اس کا ہاسپٹل جلا دیا۔“

ہاشم نے ابرو اٹھایا اور کرسی کی پشت سے بازو ہٹا کر قدرے آگے کو ہوا۔ چہرے پہ حیرت بھری مسکراہٹ ابھری۔ ”ڈونٹ ٹیل می!“

”لیکن جسٹس سکندر کی ویڈیو میں نے لیک نہیں کی تھی۔ میرا اس سے کوئی جھگڑا نہیں ہے، اس نے مجھے بری کیا تھا۔ مگر فاطمی کا خیال ہے کہ میں اس کے پیچھے بھی آؤں گا، اس لئے وہ مجھ سے تعاون کرنا چاہتا تھا، تاکہ میں اس کو اور اس کے خاندان کو چھوڑ دوں۔“

”کیسا تعاون؟“

”اس نے کہا، وہ مجھے اس شخص کا نام بتانے کو تیار ہے جس کے ہاتھوں اس نے وارث غازی کا سودا کیا تھا۔“

”ڈنٹس گڈ۔ تمہیں اس سے معلومات لینی چاہیے تھیں۔“ ہاشم نے خوشی کا اظہار کیا۔

”اس نے تمہارا نام لیا۔ کہا کہ تم نے مروایا ہے وارث کو۔“ اسی بے نیازی سے ہاشم کو دیکھتے ہوئے بولا۔

ہاشم کی انگلیاں زور سے اندر کومڑیں، مگر چہرے پہ تاثرات ویسے ہی رہے۔ پہلے اس نے دونوں ابرو اٹھائے اور پھر ایک دم ہنس پڑا۔ ”لائیک سیر کیسلی؟“

”رکوا بھی کہانی باقی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ تم اور مسز جواہرات منی لائڈ رنگ کر رہے تھے۔ پشاور میں کسی دہشت گرد گروپ کے لئے کوئی میٹنگز وغیرہ تھیں، ان کا ریکارڈ وارث غازی کو مل گیا تھا۔“

ہاشم نے ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”اوکے اوکے..... تو میں منی لائڈر کے ساتھ قاتل بھی ہوں۔ سو..... یہ گفتگو کس طرف جارہی ہے؟ مطلب سیر کیسلی..... تمہیں یقین آگیا؟“ فارس ایک دم بے زار ہوا۔

”اگر مجھے یقین آیا ہوتا تو کیا میں یہاں بیٹھا تمہیں یہ سب بتا رہا ہوتا؟“

”تو تمہیں یقین کیوں نہیں آیا؟ ہو سکتا ہے وہ سچ بول رہا ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے محظوظ لگ رہا تھا۔

”کیونکہ میں عرصے پہلے نیب کے وہ سارے ریفرنریز چیک کر چکا ہوں جو تمہارے خلاف دائر تھے، وہ سب کرپشن کیسز تھے اور مجھے یقین ہے تم ان سب میں ملوث ہو (ہاشم نے مسکرا کر اثبات میں سر کو خم دیا۔) مگر وہاں منی لائڈرنگ کا کوئی کیس نہیں تھا۔ دوسری بات، وہ مجھ سے تعاون نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ مجھے اپنے ہی خاندان سے لڑوا کر کمزور کرنا چاہتا ہے۔ دیکھو میرے تمہارے بہت جھگڑے ہوں گے، مگر ہم ایک خاندان ہیں۔ اس لئے تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔“

”شیور۔ بتاؤ۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟“ وہ اب اپنائیت سے کہتا آگے کو ہوا۔

”الیاس فاطمی کا ایک بھائی ہے، وہ کسٹم میں ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے وہی وارث کا قاتل ہے۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ۔ تم اس کو چیک کرو۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے فاطمی جانے سے پہلے اپنے بھائی کو بچانے کے لئے مجھے کسی دوسری طرف لگانا چاہتا ہے۔“

”جانے سے پہلے؟“ پہلی دفعہ ہاشم کے ابرو حقیقی حیرت سے بھنچے۔

”ہاں اس نے کچھ کہا تھا جانے کے بارے میں۔ وہ اپنی بیٹی کو یا شاید فیملی کو باہر سیٹل کر رہا ہے۔ اسے دیکھ کر میرا خون اتنا ابل رہا تھا کہ اس کی آدمی بات میں نے دھیان سے سنی ہی نہیں۔“ سر جھٹک کر وہ جیسے پھر سے غصے میں آنے لگا تھا۔

”اوکے ریلیکس۔ میں تحقیق کروانے کی کوشش کرتا ہوں، مگر مجھے یا تمہیں فاطمی جیسے لوگوں کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ان کے الزامات سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟“ شانے اچکا کر وہ اسی طرح کی چند مزید نرم سی باتیں کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا البتہ جب وہ جانے کے لیے مڑا تو اس کی آنکھوں میں شدید سختی درآئی تھی اور انگلیاں زور سے اندر کونچنی ہوئی تھیں۔

اس کے جاتے ہی زمر اندر آئی تھی۔ حیران، متعجب، مشکوک۔

”آج تو تم سے ملاقات ناممکن ہو گئی تھی۔“ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے وہ شدید الجھن کا شکار تھی۔ ”یہ ہاشم کیوں آیا تھا تم سے ملنے؟“

”میں نے بلایا تھا۔“

”کیوں؟ کیا بات کرنی تھی؟“ زمر نے پتلیاں سکڑ کر اسے دیکھا۔

”یہی کہ اس کا کتا بہت آوارہ ہوتا جا رہا ہے، اور وہ میری طرف..... ہماری طرف آگیا تھا۔ اسے اتنا کہا ہے کہ اپنے کتے کا خیال رکھے۔“

زمر نے ڈھٹائی سے شانے اچکائے۔ ”کتا ہی تھا؟ آگیا تو کیا ہوا؟ اتنی سی بات کے لئے اسے کیوں بلایا؟“

”وہ ہلکا سا مسکرایا۔“ کیونکہ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ ہماری طرف آیا ہے، مگر وہ اس کا پالتو کتا ہے، زمر، وہ اسے جلد یا بدیر ضرور بتائے گا ہر بات۔ سو میں نے سوچا کہ میں پہلے بتادوں۔“

زمر مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ”مجھے تمہاری بات پہ یقین کیوں نہیں آ رہا؟“

”اوہ کم آن!“ وہ حیران ہوا۔ ”تم نے خود ہی تو کہا تھا، کچھ نہ کرو، شریف بن کر رہو، تو میں اس لئے آرام سے بیٹھا ہوں، کچھ بھی نہیں کر رہا۔“ بہت ہی سادگی سے اپنے خالی ہاتھ دکھائے۔

زمر نے جھر جھری لے کر سر جھٹکا۔ وہ واقعی شرافت اور سادگی کے ساتھ آرام سے بیٹھا تھا۔ وہ واقعی کچھ نہیں کر رہا تھا۔ اس کو فارس پہ اعتبار کرنا چاہیے۔



جو ہو سکے تو محبت کی پاسداری کر..... مرا جو رنگ ہے اس میں قبول کر مجھ کو

پرغم فضاؤں کی سرزمین پہ وہ تہہ خانے میں بنے کمرے خاموش تھے۔ سعدی یوسف اپنی اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھا، قرآن کھولے، ساتھ جرنل پہ قلم سے کچھ لکھے جا رہا تھا۔ اب وہ پڑھتے ہوئے ساتھ میں لکھتا بھی تھا۔ یہاں وقت ہی وقت تھا، فراغت ہی فراغت تھی۔

”میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کی دھنکارے ہوئے شیطان سے۔“ تعویذ پڑھ کر اس نے مطلوبہ جگہ سے انمل کھولی اور گردن ترجھی کر کے بیٹھا، آیات صفحے پہ اتارنے لگا۔ سیاہی ٹی شرٹ میں ملبوس بیٹھا، وہ لکھتے ہوئے بالکل منہمک اور مصروف دکھائی دیتا تھا۔

”اور بے شک ہم نے بھیجا قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو۔ کہ عبادت کرو اللہ کی۔ تو دفعتاً وہ دو فریق تھے جو باہم جھگڑ رہے تھے۔“

قلم لبوں میں دبائے، چند لمحوں کو اس نے سوچا، پھر تیز تیز قلم صفحے پہ چلانے لگا۔

”جب کوئی ہمارے پاس اللہ کی بات لے کر آتا ہے، تو مجھے یہ سمجھ نہیں آتا اللہ تعالیٰ کہ ہم اسی سے جھگڑنا کیوں شروع کر دیتے ہیں؟ ہم فوراً اس کا فرقہ، اس کا عقیدہ، اس کا خاندان، اس سب کو زیر بحث کیوں لے آتے ہیں؟ نہیں ماننی بات، نہ مانو۔ مگر ہم ایسی قوم کیوں بننے جا رہے ہیں جو برائی پھیلانے والوں کو توئی دی کے آگے جم کر بیٹھ کر دیکھتی ہے، مگر نیکی کا حکم دینے والوں پہ فوراً سے فتوے لگا دیتی ہے؟ اور مجھے یہ کبھی سمجھ نہیں آیا کہ قوم ثمود، قوم عاد اور قوم لوط..... بار بار ان کا ذکر کیوں آ جاتا ہے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں ان کے ناموں اور ان پہ اتارے عذابوں کو کس اپ کر جاتا ہوں۔ یہ پورا قرآن پڑھ کر بھی مجھے یاد نہیں ہو پائے۔ ان کو یاد رکھنا بہت ضروری ہے۔“

لکھتے بھر کو رک کر اس نے پھر سے وہی آیت پڑھی۔ ذہن میں آگئی کے کتنے ہی در کھلنے لگے۔ معانی منکشف ہونے لگے۔

”اللہ تعالیٰ آپ نے فرمایا، کہ ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی، کو بھیجا۔ ثمود کے لوگوں کا بھائی صالح! یعنی اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے پاس ان کے جیسے ہی کسی بندے کو بھیجتے ہیں۔ اس میں بھی انہی جیسی خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں تاکہ لوگ اس سے relate کر سکیں، مگر نہیں، ہمیں تو مبلغ کے نام پہ فرشتہ چاہیے ہوتا ہے۔ پہلے زمانوں کے لوگ بھی یہی کہتے تھے، اللہ نے فرشتہ کیوں نہیں اتارا؟ اب بھی یہی کہتے ہیں، اس عالم، اس مبلغ میں فرشتوں والی خصوصیات کیوں نہیں ہیں؟“ پھر سر جھٹک کر اگلی آیت پڑھی۔

”کہا (صالح) نے، اے میری قوم، کیوں تم برائی کو بھلائی سے پہلے مانگنے میں جلدی کر رہے ہو؟ کیوں نہیں تم اللہ سے بخشش مانگتے تاکہ تم پہ رحم کیا جائے؟“ وہ ہلکا سا مسکرایا اور پھر اسی طرح لکھنے لگا۔

”اللہ تعالیٰ۔“ مجھے اس آیت کو پڑھ کر ہمیشہ یہ لگا ہے کہ انسان اپنی دعاؤں سے پہچانا جاتا ہے۔ بے اختیاری میں منہ سے نکلے دعائیں

اندروں کی کشمکش کی عکاس ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں لوگ فوراً قیامت مانگ لیتے تھے کہ بھی نازل کرو فرشتہ اور برابر کرو حساب۔ آج کل کے لوگ خود ہی جج مینٹل ہو کر سارے حساب کتاب پورے کر دیتے ہیں۔ مبلغ کو بھی کٹہرے میں لا کھڑا کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ خود ہی جج، جیوری، اور جلا دین کر دیں والوں کا فیصلہ سنا دیں۔ اطاعت نہ کرنے کے بھی کتنے بہانے ہیں انسانوں کے پاس!

ذرا دیر کو قلم والا ہاتھ روکا۔ درمیانی انگلی کے اوپری پورے میں درد سا ہونے لگا تھا۔ writer's ache! لکھنا کتنا مشکل کام تھا! پند لمبے کے آرام کے بعد آگے پڑھنے لگا۔

”ان لوگوں نے کہا، ہم برا شگون لیتے ہیں تم سے اور ان سے جو تمہارے ساتھ ہیں۔ کہا (صالح نے) تمہارا شگون اللہ کے پاس ہے، بلکہ تم ایک گروہ ہو جو آزمائے جا رہے ہو۔“

”عربی کتنی دلچسپ زبان ہے اللہ تعالیٰ۔“ وہ مسکراتے ہوئے تیز تیز قلم چلا رہا تھا۔ ”شگون کے لئے طائر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ طائر کہتے ہیں پرندے کو۔ اہل عرب پرندوں سے فال لیا کرتے تھے۔ سو شمو دوالے صالح علیہ السلام کو یہ بتا رہے ہیں کہ ہمیں تو تم سے ”بری لینگ“ آتی ہے اور تمہارے ساتھ والے مومنین سے بھی۔ یہ انسان کی ایک بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ جب آپ کو کسی کی بات نہیں مانتی تو اس کو اور اس کے ساتھ موجود تمام ہم خیال لوگوں کو لیبیل کر دو۔ ان کو کوئی بھی نام دے دو۔ سیکولر، ماڈرن قسم کے لوگ ایسے مبلغین کو ”قدامت پسند، دقیقہ نوسی، شدت پسند“ کہتے ہیں۔ اور دین والے جن کی عادت ہوتی ہے دوسرے دین والوں کی ٹانگ کھینچنا، وہ ان کو ”کم علم، کم عقل، گناہگار، ناپاک“ اور ایسے ہر اس لقب سے پکارتے ہیں جن میں کہنے والے کی پاکیزگی کی نمائش ہو، اور بے چارے مبلغ کی تذلیل ہو۔ بہانے۔ سب بہانے ہیں۔ کہ بس کسی طرح حق بات ماننے سے بچ جاؤ۔ اس وقت ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ تو محض ایک آزمائش ہے۔ ہم خدا نہیں ہیں، پھر خدا کی طرح لوگوں کو جج کیوں کرنے لگتے ہیں؟ ہم خود فرشتے نہیں ہیں، پھر فرشتوں کی طرح لوگوں کے گناہوں اور خامیوں کا حساب کتاب کیوں رکھتے ہیں؟“

سفید صفحہ دھیرے دھیرے سیاہ ہو رہا تھا۔ اسے لگا آج وہ تلخ باتیں سوچ رہا ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ خود بھی تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ خاور ٹھیک کہتا تھا۔ وہ اپنی معصومیت کھوتا جا رہا تھا۔

ادھر قرآن فرما رہا تھا۔ ”اور تھے شہر میں نوگروہ۔ وہ فساد کرتے تھے زمین میں اور نہیں کرتے تھے وہ اصلاح۔ کہا انہوں نے، کھاؤ قسم اللہ کی! البتہ ہم ضرور رات کو اس (صالح) اور اس کے گھر والوں پہ حملہ کریں گے اور پھر بعد میں ہم اس کے سر پرست سے کہیں گے کہ نہیں تھے ہم موجود اس کے خاندان کی ہلاکت کے وقت (اس جگہ پہ) اور بے شک ہم ہی سچے ہیں۔“

”نوگروہ؟ سبحان اللہ۔“ وہ مسکرا کر لکھنے لگا۔ ”مکہ میں بھی نو بڑے قبائل تھے۔ اور اسی طرح انہوں نے بھی ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں چال چلی تھی کہ رات کو ہم وہ ناپاک کام کر لیں گے اور صبح معصوم بن جائیں گے۔ آج کل کے مبلغین کے لیے بھی لوگ چالیں چلا کرتے ہیں، مگر لوگوں کو ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ ”فساد“ پھیلانے والے وہی ہوتے ہیں جو خود کسی کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ خیر، دلچسپ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کہ وہ بھی آپ کے نام کی قسم اٹھا رہے تھے۔ آج بھی لوگ آپ کا نام لے کر جہاد کا نام لے کر بے گناہ مسلمانوں اور بے گناہ غیر مسلموں کا قتل عام کرتے ہیں۔ اور دنیا بھر کا میڈیا کہتا ہے یہ مسلمان ہیں۔ اگر اللہ کا نام لینے سے کوئی مسلمان ہو جاتا تو صالح علیہ السلام کے دشمن کیوں مسلمان نہ تھے؟ ایسے ہی نہیں ہو جاتا کوئی مسلمان۔ یہ نام مسلمان ہمارے باپ ابراہیم علیہ السلام نے رکھا تھا اور اس کو ”پانے“ کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اللہ کے لئے لڑنے والے اور اللہ کا نام لے کر اپنے مذموم مقاصد کے لئے لڑنے

والے برابر نہیں ہوتے۔“

لفظ سیاہ جگمگاتے ہیروں کی طرح دودھیا کاغذ پہ بکھرے تھے اور وہ دھیرے دھیرے گویا مزید گنگنے پر درہا تھا۔
 ”اور انہوں نے چلی ایک چال۔ اور ہم نے کی ایک تدبیر۔ اور وہ شعور نہیں رکھتے تھے، پس دیکھو کس طرح انجام ہوا ان کی چال کا۔
 بے شک ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو، اور ان کی قوم سب کے سب کو!“

”استغفر اللہ!“ اس نے جھر جھری لی اور پھر سے قلم کاغذ پہ رگڑنے لگا۔ ”اور انبیاء ایسے لوگوں کی چالوں سے نہیں ڈرا کرتے کیوں کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اللہ ہر اس چیز سے بڑا ہے جس سے انسان خوف کھاتا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام کی ایک چیخ آئی، اور پھر زلزلہ آیا۔ اور وہ ساری قوم تباہ ہو گئی۔“ لکھتے لکھتے اس نے قرآن کے جگمگاتے مگر اداس کردینے والے حروف کو دیکھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”تو یہ ہیں ان کے گھر.... خالی گرے ہوئے، بوجہ اسکے جو انہوں نے ظلم کیا۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے اس قوم کے لئے جو علم رکھتی ہے۔ اور ہم نے نجات دی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جو (گناہوں سے) بچتے رہے۔“

سعدی نے چند لمحے کے لئے آنکھیں بند کیں۔ ایک دم قلم خالی ہو گیا تھا۔ وہ اسی طرح بند آنکھوں کے ساتھ لبوں سے بڑبڑانے لگا۔ ”وہ علاقے.... وہ تباہ حالی بستیاں آج بھی زمین پہ موجود ہیں.... ثمود اور عاد کے علاقے.... بالکل بنجر اور ویران۔ کتنی ہی دفعہ سائنسدان ان علاقوں کی مٹی اٹھا کر اپنی لیب میں لے کر آئے کہ ایسا کیا ہے اس مٹی میں جو یہ مردہ ہے، یہاں کوئی چیز نہیں اگتی؟ مگر ہوا کیا۔ اس مٹی سے تابکاری شعاعیں نکلتی ہیں۔ اس پہ تجربہ کرنے والے سائنسدان، لیب میں کام کرنے والے ملازم تک کینسر کا شکار ہو گئے۔ جس بھی جگہ وہ مٹی رکھی جاتی، وہ اس جگہ کو گلگانے اور جلانے لگتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں وہ مٹی زہریلی ہے، میں کہتا ہوں یہ گناہ تھے جو انسان کو ہی نہیں اسکے خاندان، اسکے ملک حتیٰ کہ اس کی مٹی کو بھی تباہ کر دیتے ہیں۔ مگر ہم لوگ عبرت نہیں پکڑتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی لئے فرمایا کرتے تھے کہ ان علاقوں سے تیزی سے گزر جایا کر دیا پھر روتے ہوئے گزرا کرو، مگر ہم لوگ.... ہم جاہل لوگ، موجد اور ہڑپہ جا کر اسکول ٹرپ کے ساتھ پکنک مناتے ہیں! تباہ حال بستیوں اور کھنڈرات، چاہے ان کا ذکر قرآن میں ہو یا نہ ہو، ان پر سے دیے گزرنا چاہیے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ ان پہ تحقیق کرنا، ان کو اسٹڈی کرنا الگ بات ہے، مگر سیر اور پکنک کے لئے ان جگہوں پہ جانا.... مسلمانوں کو اندازہ ہی نہیں کہ وہ کتنے ہولناک کام کتنی آسانی سے کر جاتے ہیں۔“

اور جس وقت وہ ساری دنیا سے بے نیاز لکھے جا رہا تھا، اس سے سینکڑوں ہزاروں میل دور، اپنے آفس میں مرکزی سیٹ پہ بیٹھی جواہرات، مسکرا کر سامنے کھڑے حبشی صورت اور براق سفید دانتوں والے فصیح (ہارون عبید کے ملازم خاص) کو دیکھ رہی تھی جو ہاتھ باندھے کھڑا اطلاع دے رہا تھا۔

”آپ کے کہنے پہ ہم نے سعدی یوسف کو کرنل خاور سے ملاقات کی اجازت دے دی ہے۔ ہارون صاحب، میرے اور آپ کے درمیان ہی رہے گی یہ بات۔“

”گڈ!“ وہ پورے دل سے مسکرائی۔ گھومنے والی کرسی کو ذرا سا گھمایا۔

”خاور کی زنجیریں کھول دو، اسے سعدی کے ساتھ کھلنے ملنے دو۔ وہ دونوں ہمارے لئے بے کار ہیں، میرا بیٹا یہ بات نہیں سمجھ رہا، اسلئے

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم خود کوئی قدم اٹھائیں کیونکہ یہ میرا تجربہ کہتا ہے وہ دونوں فرار کا سوچ رہے ہوں گے۔“

”یس میم!“ اس نے سر کو خم دیا۔ ”ہم ان کی باتیں تو نہیں سن سکتے لیکن وہ یہی پلان کر رہے ہوں گے۔“

”مگر ہو سکتا ہے فصیح کہ کسی دن خاورِ سعدی کو قتل کر دے اور پھر خود کشی کر لے۔“

فصیح کے ابرو تعجب سے بھنچے۔ ”مگر وہ ایسا کیوں کرے گا؟“

”تم کرو گے فصیح!“ وہ میز پر دونوں ہاتھ رکھ کر اٹھی اور شیرنی جیسی سفاک آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اور اتنی صفائی سے کرو

”ایک رات یہ سب“ کا اگلی صبح ان دونوں کی لاشیں ملنے کے بعد تم یہ کہہ سکو گے کہ تم تو اس جگہ تھے ہی نہیں۔ میرے بیٹے کو خبر بھی نہیں ہوگی۔“

”یہ سب آپ لوگوں کو بہت پہلے کرنا چاہیے تھا“ مگر ابھی بھی دیر نہیں ہوئی۔ میں ویسا ہی کروں گا جیسا آپ کہہ رہی ہیں!“ پلکیں

مڑا لٹھاتے ہوئے اس نے تائید کی۔

اس کے جانے کے بعد جواہرات نے کرسی کی پشت سے سر نکال دیا اور مسکراتے ہوئے چھت پہ لٹکتے، جھللاتے فانوس کو دیکھا۔

زندگی ایک دم کتنی خوبصورت لگنے لگی تھی۔

اس کا بھاری سر ہر بوجھ سے آزاد تھا!



باب 19:

حق دفاع از خویش

ایک قانون ایسا ہے
 جو نہیں ہے کہیں لکھا ہوا
 مگر نقش ہے ہمارے دلوں پر!
 وہ قانون جو ہمیں نہیں ملا
 تربیت، رواج یا کتابوں سے،
 بلکہ اس کو اخذ اور جذب کیا ہے ہم نے
 عین فطرت سے!
 وہ قانون جو ہم تک نہیں پہنچا تھیوری سے
 بلکہ پہنچا ہے عمل سے۔
 ہمیں نہیں دیا گیا وہ احکام کے ذریعے
 بلکہ سیکھا ہے ہم نے اسے الہام کے ذریعے!
 میں بات کر رہا ہوں اس قانون کی
 جو کہتا ہے کہ
 اگر ہماری جان کو خطرہ لاحق ہو
 سازشوں سے،
 تشدد سے،
 مسلح حملہ آوروں سے،
 یا دشمنوں سے،
 تو کوئی بھی طریقہ
 اور ہر طریقہ جو ہم استعمال کریں
 اپنے دفاع کے لیے

وہ ہوتا ہے اخلاقی طور پر

درست اور جائز!

(Marcus Tullius Cicero)

جیل کے احاطے میں صبح کی دھند پھیلی تھی۔ قیدی بیدار ہوئے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ ایسے میں وہ اپنے میٹرس کے کنارے چپ چاپ اکڑوں بیٹھا تھا۔ جنبر کے اوپر سفید کرتا پہنے، دودن کی بڑھی شیو والے چہرے کے ساتھ، خاموش آنکھوں کو ہاتھوں پہ جمائے بیٹھا، وہ انگلیوں پہ مسلسل ریز بینڈ پلٹ رہا تھا۔ آنکھوں میں گہری مایوسی مگر صبر بسا تھا۔ دفعتاً کوئی اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتا ساتھ آ بیٹھا۔ فارس نے ہونکے بناذرا سی گردن موڑی۔ وہ سکھوں کی سی داڑھی مونچھ والا آتش تھا۔ مسکرا کر اس کو کہنے لگا۔

”پریشان ہو غازی!“

”نہ ہوں؟“ اس نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

”تو ہار چلا جائے گا یار، فکر نہ کر۔ وہ کیا لکھا ہوتا ہوتا ہے قانون کی کتابوں میں؟ ملزم قانون کی پسندیدہ اولاد ہوتا ہے۔ قانون میں سارے فائدے اسی کو ملتے ہیں۔“ اس نے مسکرا کر ناک سے مکھی اڑائی۔ فارس نے جواب نہیں دیا۔ ریز بینڈ کو تیزی سے انگلیوں پہ باندھتا کھولتا رہا۔

”ایک زمانے میں تو بہت نمازیں پڑھتا تھا غازی۔“

”اب بھی پڑھتا ہوں۔ کچھ دن پڑھی۔ کچھ دن چھوڑ دی۔“ کندھے جھٹک کر کہتے، اس کی نگاہیں ریز بینڈ پہ جمی تھیں۔

”عادت کیوں نہیں بناتا؟“

”نہیں بنتی۔ کچھ دن دل زندہ رہتا ہے۔ پھر ہفتے گزر جاتے ہیں اور میں مردہ دل لیے پھرتا ہوں۔“ استہزایہ سر جھٹک کر اب وہ تیز

ریز بینڈ کو انگلیوں پہ پلٹ رہا تھا۔

”میں بھی عید کے عید پڑھتا ہوں ویسے تو نماز لیکن....“ آتش کھنکھار کر اس کے قریب ٹیک لگا کر بیٹھا اور سوچتی نظروں سے چھت کو

دیکھنے لگا۔ ”ایمان میرا مضبوط ہے۔ پہلے دن کی طرح۔“

فارس نے اس بات پہ تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ ”دیکھو کون کہہ رہا ہے۔“ آتش اور آتش کی تاریخ سے کون نہیں

واقف تھا، مگر وہ قصہ تم پھر کبھی سنو گے۔

”سچ کہہ رہا ہوں۔ تیرا ایمان خدا پہ کمزور ہے۔“

”مجھے اب یقین نہیں آتا آتش کہ کوئی خدا ہے بھی یا نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے انگلی پہ بل در بل لپٹیتے بولا تھا۔ انگلی کسی گئی تھی۔ خون رک

گیا تھا۔ آدھی انگلی سرخ اور آدھی سفید پڑنے لگی تھی۔

”ہیں؟“ وہ چونکا۔

”اگر خدا ہوتا تو کوئی میرے بھائی کو یوں قتل نہ کرتا، میری بے گناہ بیوی کو نہ مارتا۔ میرے چار سال جیل میں ضائع نہ ہوتے۔ مجھے

اب یقین نہیں رہا کہ کوئی خدا ہے بھی یا یہ صرف لوگوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے بنائے گئے مذاہب ہیں۔“ وہ تلخی سے بول رہا تھا۔ آتش نے

گہرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ جس کا ڈر تھا وہ قریب میں ہی بیٹھا تھا۔ ”مولوی“۔ وہ داڑھی والا نوجوان جو چھ ماہ سے ادھر قید تھا، وہیں بیٹھا سنجیدگی

سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ آتش داڑھی کھجاتے ہوئے اس کے قریب کھسکا۔

”آہستہ بول۔ نیا جھگڑا شروع ہو جائے گا۔“

اس بات پہ فارس نے نظر اٹھا کر دائیں بائیں دیکھا اور اس نوجوان کو اپنی طرف متوجہ پایا۔

”ہاں بھئی، کوئی مسئلہ ہے تمہیں؟“ تیوری چڑھا کر وہ اسے گھور کر بولا تھا۔ اس نوجوان نے گہری سانس لی۔

”پرانی کہانی ہے، مگر سنا دیتا ہوں۔ ایک مومن شخص ایک حجام کے پاس بال بنوانے آیا تو...“ وہ متوازن لہجے میں، فارس کی آنکھوں سے نگاہیں ہٹائے بغیر کہنے لگا۔ ”تو حجام نے اس سے کہا، مجھے نہیں یقین کہ کوئی خدا وجود رکھتا ہے، اگر وہ ہوتا تو اتنے بھوکے بیمار، اور دکھی لوگ ایسے بے بسی کی زندگی نہ گزار رہے ہوتے۔ مومن سن کر چپ رہا، لیکن جب وہ باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ گلی میں چند ہی پھر رہے ہیں۔ بے تھانا بڑھی ہوئی داڑھی مونچھ اور الجھے گندے بالوں والے لوگ۔ وہ فوراً اندر واپس آیا اور حجام سے بولا۔ ”میرا نہیں خیال کہ اس دنیا میں کوئی مہم ہے۔“ حجام نے سے حیرت سے پوچھا۔ ”مجھ سے بال بنوانے کے باوجود بھی تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟“ تو مومن آدمی نے کہا، اگر کوئی حجام ہوتا تو گلی میں گندے بالوں اور بڑھی ہوئی شیو والے لوگ نہ پھر رہے ہوتے۔ اس بات پہ حجام نے کہا...“ نوجوان سانس لینے کو رکا۔ ”کہ وہ لوگ اس لیے اس حال میں نہیں ہیں کہ اس شہر میں کوئی حجام نہیں ہے، بلکہ وہ اس حالت میں اس لیے ہیں کیونکہ... وہ میرے پاس نہیں آتے۔“ متانت سے بات مکمل کر کے نوجوان اٹھ گیا۔ آتش کھینا سا ہنسا۔

”یہ مولوی بڑی سیانی باتیں کرتا ہے۔“ مگر فارس نہیں ہنسا۔ خاموش، سپاٹ نظروں سے اپنی آدھی سرخ، آدھی سفید انگلی کو دیکھتے ہوئے اس نے رزبینڈ زور سے کھینچ کر توڑ دیا۔ انگلی آزاد ہو گئی۔ خون کا راستہ کھل گیا۔ وہ اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔



یہ دکھ ہے اس کا کوئی ایک ڈھب تو ہوتا نہیں..... ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ جی ٹھہر بھی گیا وہ ایک دھند میں لپٹی اتار کی صبح تھی۔ جہاں شہر ابھی تک سستی اور نیند میں ڈوبا تھا وہاں قصر کا دروازہ اندر سے سینٹرلی میٹنگ سسٹم لی گرامش میں بسا، مکمل طور پہ بیدار تھا۔ ملازم مستعدی سے ادھر ادھر پھرتے کام پتار رہے تھے۔ کنٹرول روم میں احمر کافی کنگ سے گھونٹ بھرتا، کمپیوٹر پہ کھٹا کھٹ کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ جینز پہ ہلکا سویٹر پہننے بیٹھ کرے باوجود ناک سرخ ہو رہی تھی۔ ہاشم اپنے کمرے میں صوفے پہ نیم دراز، پیجر میز پہ رکھے ساتھ بیٹھی سونیا سے مسکرا کر کچھ کہہ رہا تھا اور وہ تیز تیز بولتی چمکتی آنکھوں سے اسے کوئی قصہ سنار ہی تھی۔

ایسے میں نو شیر وال کے کمرے میں بستر خالی تھا۔ لحاف آدھا بیڈ پہ آدھا زمین پہ لٹک رہا تھا۔ عرصہ ہوا وہ دیر سے اٹھنا چھوڑ چکا تھا۔ نیند اب ویسے مہربان نہیں ہوتی تھی۔ وہ الماری کے سامنے زمین پہ چوڑی ڈال کر بیٹھا تھا اور گھٹنوں پہ فوٹو البم کھولے آہستہ آہستہ صفحے پلٹ رہا تھا۔ رف سے ٹراڈز اور نیلی ٹی شرٹ میں ملبوس اس کے سپانگس بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پہ دیرانی تھی۔

وہ ہاشم کے ویسے کی تصویریں تھیں۔ سفید لباس میں دلہن بنی شہری کو دیکھ کر دل میں کوئی جذبہ نہ جاگا دفعتاً ایک تصویر پہ وہ رکا۔ آنکھیں سکڑیں۔ وہ اورنگزیب کے گلے لگ رہا تھا۔ فوٹو گرافر نے ایک ایک لمحہ گویا عکس بند کیا تھا۔ اورنگزیب قدرے حیران تھے اور شیر وال کی آنکھیں نم تھیں۔ اوپر پرینگ پہ ہاتھ رکھے جواہرات اور سعدی کھڑے تھے۔ جواہرات کا سرخ لباس... وہ اس سرخ رنگ میں انک گیا۔ ایک دم جیسے سرخ پانی ما سعدی کے اوپر بہنے لگا... پھر اورنگزیب کے اوپر... شیر وال کے ہاتھ تک سرخ مائع سے بھگتے گئے۔

اس نے البم پھینکا اور تیزی سے ہاتھ جھاڑے۔ وہ صاف تھے۔ البم صاف تھی۔ کوئی خون نہیں، کوئی نمی نہیں۔ وہ آنکھیں مسانا آہستہ سے بیڈ کی طرف واپس آیا اور بیٹھتے ہوئے سر ہاتھوں میں گرا لیا۔ پھر موبائل اٹھایا اور فیس بک انباکس کھول کر ”علیشا ربیکا کا ردار“ لکھ کیا۔

”سورہی ہو؟“ (جانتا تھا اس کی رات گہری ہوگی۔)

”نہیں۔ پڑھائی کر رہی تھی۔“ وہ کچھ دیر ٹھہری۔ ”تم کیا کر رہے ہو؟“

”میں ڈیڈ کی پرانی تصاویر دیکھ رہا تھا۔ تمہیں وہ یاد نہیں آتے علیشا؟“
”میرا ان سے کبھی کوئی قلبی تعلق نہیں تھا۔“

شیر و کا دل بری طرح دکھا۔ وہ خاموشی سے اسکرین کو دیکھے گیا۔ کچھ دیر بعد علیشا کا پیغام چکا۔ ”میں اندر سے ہمیشہ ان کی توجہ کی طلب گار رہی ہوں۔ اکثر خواب میں دیکھتی ہوں کہ وہ زندہ ہو گئے ہیں اور وہ جوان کے مرنے کی خبر سنئی تھی وہ جھوٹ تھی۔“
”میں بھی!“ اس نے لکھتے ہوئے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ پھر کچھ دیر سوچتا رہا۔

”کدھر گئے؟ اگر بات یونہی ادھوری چھوڑ دینی ہوتی ہے ہر رات تو مجھے میسج کیوں کرتے ہو؟“ وہ خفا ہوئی تھی۔
”میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ تمہارا حق ہے کہ تم جانو!“ ایک فیصلہ کر کے وہ لکھ رہا تھا۔۔۔

شیر و کے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانک تو سانس دھندلکوں کے پار انیسویں کھڑکی تھی۔ فارس کے کمرے کی کھڑکی سے ٹیک لگائے مین فرش پہ بیٹھی تھی۔ چھوٹا سا اپنے اوپر پھیلانے، مونگ پھلی کھاتے ہوئے لیپ ٹاپ گود میں رکھے، آج عرصے بعد وہ فراغت سے بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ (نیچے امی اور صداقت نے کچن سنبھال رکھا تھا۔ صداقت بیوی کو فی الحال گاؤں چھوڑ کر ادھر آ گیا تھا۔)

حنین کے قریب زمر کرسی پہ ٹیک لگا کر بیٹھی، قلم لبوں میں دبائے سوچ میں گم تھی۔ اس کے کھلے گھنگریالے بال کرسی کی پشت سے نیچے گر رہے تھے اور چھت پہ جمی آنکھوں میں الجھن سی تھی۔

”یہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔“ ایک نیچے پہنچ کر اس نے چہرہ سیدھا کیا اور کرسی حنہ کی طرف گھمائی۔
”ہوں!“ حنہ نے بغیر غور سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

”قمر الدین کا قتل اس رات نہیں ہوا۔ خاور کو جب علم ہوا کہ فارس اس رات کچھ کر چکا ہے تو اس نے اگلی صبح قمر الدین کو مرنے والا اور ڈاکٹر اور گواہوں کو خرید کر موت کا وقت بدل دیا۔ لاش تو اگلی دوپہر ہی ملی تھی نا۔ تم کیا کر رہی ہو؟“ آخر میں الجھ کر ابرو بھینچے۔ جواب نہ آیا تو وہ اگلی اور حنہ کے ساتھ نیچے کارپٹ پہ بیٹھی۔

”نوشیر و! علیشا...؟ یہ کیا ہے؟“ اس نے چونک کر حنہ کا چہرہ دیکھا۔

”وہ۔ میں نے شیر و بھائی کا اکاؤنٹ Phishing کے ذریعے ہیک کیا ہے۔۔۔ اور... اب اس لوڈز کے میسجز پڑھ رہی ہوں!“ پھر زمر کے تاثرات دیکھے۔ ”ایسے مت دیکھیں ان کا علیشا سے رابطہ بحال ہو گیا ہے، مجھے وجہ جانی ہے!“
”حنین ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم کاردارز کے نیٹ ورک کو نہیں چھیڑیں گے۔“ زمر سنجیدہ تھی۔

”مگر اب خاور نہیں ہے تو ڈرکس کا؟“ زمر بہت کچھ کہنے لگی تھی پھر گردن موڑ کر دھند میں ڈوبے قصر کو دیکھا۔ ”ویسے یہ خاور گیا کہاں؟ عرصے سے نظر نہیں آیا۔“ خاور کا ذکر کرتے ہوئے اس کی ٹون سرد ہو جاتی تھی، جیسے ہاشم کے لیے ہوتی تھی۔ سرد اور بے رحم۔ مگر اسے ان لوگوں سے وہ نفرت نہیں محسوس ہوتی تھی جو فارس غازی سے ایک زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ وہ اس کے اپنے نہیں تھے۔ وہ غیر تھے اور فارس سب کچھ تھا، وہ بس غیر نہیں تھا۔

”اوہ گاڈ! یہ پڑھیں۔“ حنین تیزی سے سیدھی ہو کر بیٹھی۔ زمر چونک کر اسکرین کو دیکھنے لگی۔

نوشیر و! ”تمہارا حق ہے کہ تم یہ بات جانو۔“

علیشا: ”کیا؟“

نوشیر و! ”ڈیڈ... ہمارے ڈیڈ کو... قتل کیا گیا تھا۔“ (زمر کے ابرو تعجب سے اٹھے۔ حنہ ہکا بکا تھی۔)

علیشا: ”واٹ؟ مگر... کیسے؟ ہاشم نے تو کہا تھا کہ ان کی موت باتھ روم میں گرنے کے باعث ہوئی تھی۔“

نوشیرواں: ”ہم سب کو بھی ابھی پتہ چلا ہے۔ ان فیکٹ دو ماہ پہلے۔“

علیشا: ”کیا معلوم ہوا ہے؟ کس نے قتل کیا ہے ان کو؟“

نوشیرواں: ”ہمارے ہی سکیورٹی چیف نے۔“ (حنہ نے منہ پہ ہاتھ رکھا۔)

اسی پل بجلی چلی گئی اور وائی فائی آف ہو گیا۔ پیغامات کا راستہ رک گیا۔ حنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”وہ سب سے اچھے کارکن“

تھے۔ میرا بہت خیال کرتے تھے! بہت زیادہ۔“

زمر نے ہلکی سی سی جھر جھری لی۔ ”سکیورٹی چیف یعنی خاور نے؟“

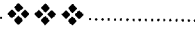
حنہ نے ناک سکڑ کر آنکھیں رگڑیں۔ ”دوسروں کے ساتھ جو کرتے تھے وہ خود اپنے ساتھ بھی ہو گیا۔ اسی لئے انہوں نے خاور“

نکال دیا۔“ مگر زمر بے چین ہو گئی تھی۔ خاور بھلا کیسے..؟

”یہ دنیا کتنی کریزی ہے؟ اوہ جنین... تمہارا کیا ہوگا؟“ حنہ بڑبڑاتے ہوئے چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ زمر نے چہرہ اٹھا کر انا

دیکھا۔ اس کی اورنگزیب صاحب سے ایک ڈینی والی تنگی تھی اور اب وہ ڈسٹرب نظر آرہی تھی۔ مگر زمر کو اس بات کو ہضم کرنے کے لیے پورا

چاہیے تھا۔ خاور ایسا کیسے...؟ اور وہ کہاں گیا؟



تمام عمر تعلق سے منحرف بھی رہے..... تمام عمر اسی کو مگر بچایا ہے

ہارون عبیدی کی رہائش گاہ پہ بھی اتوار کا خمار چھایا تھا۔ پر تیش فرنیچر سے آراستہ لاؤنج خاموش پڑا تھا۔ میزھیوں کے اوپر..... کمروں

سامنے بنے فرش پہ آبدار کھائی پہ گھڑی باندھتی چلتی آرہی تھی۔ زرد لباس پہ سرخ اسکارف چہرے کے گرد لپیٹے وہ ابروا کٹھے کیے قدر۔ نفاذ

تھی۔

دفعتاً اسٹڈی کے سامنے وہ ٹھٹھک کر رہی۔ اچنبھے سے دروازے کو دیکھا جو ذرا سا کھلا تھا۔ اندر سے مدھم باتوں کی آواز آرہی تھی

آبی خاموشی سے دروازے کے قریب آئی اور درز سے اندر جھانکا۔ اسٹڈی ٹیبل کی کرسی پہ بیٹھے ہارون کی پشت دکھائی دے

تھی۔ وہ سامنے کھڑے جشی صورت فصیح سے مخاطب تھے اور فصیح اس طرح کھڑا تھا کہ آبی کے بالکل سامنے تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر درزیں

جھانکتی آبی کو دیکھا اور پھر بنا کسی تاثر کو چہرے پہ لائے ہارون سے کہنے لگا۔

”میں کام کی بات کی طرف آتا ہوں۔“ آواز ذرا بلند کر لی۔ وہ جیسے آبی کا ہی انتظار کر رہا تھا۔

”مسز جوہرات چاہتی ہیں کہ میں خاور اور سعدی یوسف دونوں کو قتل کر دوں ایسے جیسے سعدی کو خاور نے قتل کر کے خود کشی کر لی“

ہاشم کو علم نہ ہو کیونکہ ان کی اس لڑکے کے ساتھ ایموٹل ایچ منٹ ہے۔“

”ہوں!“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔ ”کچھ معلوم ہوا کہ خاور کو کیوں قید کیا گیا ہے؟“

آبی نے سانس روکے چہرہ مزید آگے کر لیا۔ (ہامان؟)

”نہیں سر۔ اس نے رقم میں غبن کیا ہے یہی بتایا تھا ہاشم صاحب نے۔ اس سے تفتیش کرنے صرف رئیس جاتا ہے۔ میرے

اندر ہونے والی گفتگو سے لاعلم ہیں۔“

آبی الجھن سے لب کاٹنے لگی۔ (سعدی نے کیسے؟)

”اور مسز کاردار چاہتی ہیں کہ ہم ان دونوں کو ختم کروادیں؟“

”جی سر“ کیونکہ لڑکا بے کار ہے اس پہ اتنا پیسہ خرچ کرنے کا فائدہ نہیں۔ اور رہا خاور تو ہم دو ماہ سے اس پہ بھی خرچ کیے جا رہے

ہاشم کاردار کے پاس اپنی کتنی ہی جیلیں ہیں۔ مگر نہیں وہ چاہتے ہیں کہ صرف ہمارا پیسہ لگے۔“ فصیح شدید ناخوش تھا۔

”ہوں! تو پھر ٹھیک ہے۔“ وہ فیصلہ کر چکے تھے۔ گہری سانس لے کر کہنے لگے۔ ”تم ان دونوں کو ختم کر دو۔ مگر آرام سے اور احتیاط سے۔ ہاشم کو نہیں پتہ چلنا چاہیے۔ مسز کاردار کو ہماری مدد چاہیے تو ہم ان کی مدد کریں گے!“

آبی نے دکھ سے باپ کے سر کی پشت کو دیکھا اور پھر پرے ہٹ گئی۔

چند لمحوں بعد وہ لاؤنج کی سیڑھیاں اتر رہی تھی جب فصیح پیچھے سے چلتا آیا۔

”میم!“ آبی مزی اور ایک جھپتی ہوئی نگاہ اس پہ ڈالی۔

”آپ کیا کہتی ہیں؟“ آبی نے گہری سانس لے کر شانے اچکائے۔

”وہی جو تب کہا تھا جب تم نے بتایا تھا کہ مسز کاردار نے رازداری سے تمہیں اپنے آفس بلایا ہے۔ میں نیوزل ہوں۔ جو تمہیں کہا جا رہا ہے تم وہی کرو۔“

”اوکے!“ اس نے سر کو خم دیا۔

”مگر کیا تم نے وہ کیا ہے جو میں نے تمہیں کرنے کو کہا تھا؟“

فصیح نے سر ہلا کر اپنی مائی پہ لگی مائی پن اتاری، جو اندر کی طرف سے ننھے یو ایس بی پلگ جیسی تھی اور جیب سے دوسرا ٹکڑا نکال کر اس کے ساتھ جوڑا۔

”مسز کاردار کا پورا حکم بمع ان کی ویڈیو ریکارڈ ہو چکا ہے۔ چونکہ ملاقات خفیہ تھی اسی لئے مجھے سیکورٹی پروڈوکٹوں سے نہیں گزرنا پڑا۔ اگر گزرتا تب بھی میں یہ کام کر لیتا۔“ ادب سے اطلاع دی۔ ریڈرائیڈنگ ہڈ نے اس مائی پن کیسرے کو ہاتھ میں لے کر دیکھا، پھر پرسوج مگر گہری نظر فصیح پہ ڈالی۔

”کیا اس کو معلوم ہے کہ فارس غازی جیل میں ہے؟“

”نہیں ہاشم کاردار نے یہ خبر اس سے چھپانے کا حکم دیا ہے۔“

”اوکے!“ وہ مسکرا کر زینے اترنے لگی۔ ”ہاشم کے احکامات مجھ پہ لاگو نہیں ہوتے۔ یہ بات میں اسے خود بتا دوں گی۔“

”آپ؟“ وہ حیران ہوا۔ ”آپ نے دوبارہ اس سے کیوں ملنا ہے؟“

”کیا مطلب کیوں ملنا ہے؟ میں تم لوگوں کو وکیل کا نام دوں گی بد لے میں وہ مجھے انٹرویو دے گا۔ یہی ڈیل ہوئی تھی نا ہماری؟ اس نے وکیل کا نام میرے کہنے پہ دے دیا ہے، مگر میرا انٹرویو ابھی ادھار ہے۔ میں کچھ کام مکمل کر لوں پھر اس کے پاس جاؤں گی۔ تب تک اس کی موت کو نالے رکھنا۔“ ایک مٹھی میں مائی پن دہالی اور دوسرے ہاتھ سے کسی شاہزادی کی طرح اسے جانے کا اشارہ کیا۔ تخیل۔ اور وہ سر کو جھکا کر خم دیتا نیچے زینے اترتا گیا۔



سحر ہوئی تو مرے گھر کو راکھ کر دے گا وہ اک چراغ جسے رات بھر بجایا ہے

کمرے میں نیم اندھیرا سا تھا۔ مدھم نائٹ بلب جل رہا تھا، اور سعدی آنکھوں پہ بازو رکھے بستر پہ لیٹا تھا۔ اسڈی ٹیبل پہ کانڈوں کے پلندے عجیب بے ترتیبی پھیلائے دکھائی دیتے تھے۔ دفعتاً دروازہ بجا۔ وہ آنکھوں سے بازو ہٹائے بنا حلقی سے اونچا سا بولا۔ ”میں نے منع کیا ہے نا میری کہ مجھے ناشتہ نہیں کرنا۔ جان چھوڑ دو اب!“ مگر دروازہ آہستہ سے کھل گیا اور پھر بند بھی ہو گیا۔ سعدی نے بازو ہٹایا اور اندھیرے میں پلکیں جھپکا کر دیکھا۔

چو کھٹ میں خاور کھڑا تھا۔ سعدی بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ خاور دو قدم قریب آیا تو چہرہ واضح ہوا۔ نیلوں نیل، زخمی چہرے اور سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ اسے گھور رہا تھا۔

”تم ادھر کیسے؟“ وہ بے اختیار چوکناسا ایک قدم پیچھے ہٹا۔ گھٹنوں کی پشت بیڈ سے ٹکرائی۔
 ”مجھے اس کپاؤنڈ میں کھلا پھرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ زنجیریں بھی کھول دی گئی ہیں۔ آج زخموں پہ مرہم بھی لگایا گیا ہے اور اچھا کھانا بھی ملا ہے۔“ مونچھوں تلے اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے محسوس بھی نہ ہوتے تھے اور آنکھیں سرخ انگارہ سی سعدی پہ گڑی تھیں۔
 ”گڈ! یعنی ہاشم کو تمہاری بے گناہی کا احساس ہو گیا اور اب تم رہا کر دیے جاؤ گے؟“ وہ محتاط سا مزید دائیں طرف سرکا۔
 ”ڈرو نہیں بچے۔ میں تمہاری جان نہیں لوں گا۔ یہ کام ہارون عبید کے آدمی کر دیں گے۔“
 ”دیکھو اگر تو یہ تمہاری کوئی گیم ہے تو میں...“

”غور سے سنو بے وقوف!“ وہ آگے آیا اور اس کا کارڈ پکڑ کر اس کو جھکا دیا۔ ”یہ ہم دونوں کو مارنے والے ہیں۔ میرا یہاں رہنا بے سود ہے اور تمہیں یہاں مرنے دیا تو میری گواہی کون دے گا؟“

”ہاشم مجھے کبھی نہیں مارے گا۔“ اس نے ناگوار سی سے کارڈ چھڑایا۔
 ”ہا!“ وہ ہنسا۔ ”ہاشم کا یہاں صرف ایک وفادار آدمی تھا... میں! تمہارا شکر یہ اب یہاں ہاشم کا کوئی آدمی نہیں ہے۔ اس لئے... جس مقصد کے لیے تم نے مجھے اندر کر دیا ہے، میں وہ پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میرے ساتھ بھاگو گے یہاں سے؟“
 ”اچھا؟ تو تمہاری لاش کہاں ہے جس کے اوپر سے گزر کر تم نے میری مدد کرنا تھی؟“ سعدی نے ادھر ادھر دیکھ کر جیسے کچھ تلاش کرنا چاہا۔ پھر طنز یہ سر جھٹکا۔ ”میری آفر ایک پار ہو چکی ہے، خاور۔“

”تمہیں مجھ پہ بھروسہ نہیں ہے نا۔“ خاور فریبی دیوار سے ٹیک لگائے اس کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔
 ”اور کیوں کروں میں بھروسہ؟ راتوں رات تم اتنے اچھے ہو گئے کہ میری جان بچانا چاہتے ہو؟“
 ”نہ میں اچھا ہوا ہوں نہ تمہاری جان بچانا چاہتا ہوں۔ نہ میں ہاشم کا رد کار کی طرح لفظوں کے ہیر پھیر میں اچھا ہوں۔ میں نے اتنے سال ہاشم سے بھی صرف صاف باتیں ہی کہیں ہیں صاف اور کھری۔ اس لئے تمہیں بھی اپنا پلان کھرا کھرا بتا دیتا ہوں۔“ جذبات سے عاری آواز میں وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں تمہیں لے کر ہاشم کے پاس جاؤں گا، تم میرے حق میں گواہی دو گے، اصل قاتل کا نام بتاؤ گے اور پھر میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گا۔“

”واؤ۔“ سعدی کے ابرو ستائش سے اٹھے۔ ”مطلب کہ مجھے آخر میں مرنا ہی ہے تو میں یہاں کیوں نہ مروں؟“
 ”کیونکہ میرے ساتھ تم آزاد ہو گے تمہارے پاس ایک فیصد چانس ہو گا مجھ سے پیچھا چھڑا کر بھاگنے کا۔ تم یقیناً چانس لینا چاہو گے۔“

”اب مجھے تم سے امید نہیں رہی۔ ہامان کو سولی تک لانا بے سود تھا۔“ کرسی کھینچ کر بیٹھا اور لیمپ جلایا۔ کمرہ اچھا خاصا روشن ہو گیا۔ اب وہ منہ میں کچھ بڑبڑاتے اپنے کاغذ ترتیب سے رکھ رہا تھا۔

”میں نے ہاشم کو کبھی ڈاکٹر سارہ کے بارے میں نہیں بتایا۔“
 سعدی کے ہاتھ ایک دم منجمد ہوئے۔ رگوں میں خون بھی جم گیا۔ اس نے چونک کر خاور کو دیکھا۔ وہ انہی سرد تاثرات کے ساتھ کھڑا

تھا۔

”کیا مطلب؟“ سعدی کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

”اس رات جب نو شیرواں نے تم پہ حملہ کیا تھا تو تم ڈاکٹر سارہ کے ساتھ تھے۔ تم نے میسج ڈیلیٹ کر دیے تو کیا ہوا؟ میں خاور
اے۔ کرنل خاور مظاہر حیات۔ تمہارے میسج رری کور کرنا میرے بانیں ہاتھ کا کام تھا۔ اسی رات میں نے تمہارا وائس ایپ دوبارہ کھولا اور سب
نی لور کر لیا۔ مگر ہاشم کو نہیں بتایا۔“

سعدی نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ ”مگر تم غلطی کر گئے ہو۔ میں نے ڈاکٹر سارہ کو بلایا ضرور تھا مگر وہ نہیں آسکی تھیں۔“
”تم اب پہلے سے بہتر جھوٹ بول لیتے ہو۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا تم اپنی معصومیت کھوتے جا رہے ہو۔ سارہ نہ صرف وہاں آئی
تھی بلکہ اسی نے پولیس کو بلایا تھا۔ پریشان نہ ہو میں نے ہاشم کو نہیں بتایا، نہ بتاؤں گا۔“

سعدی بے بسی بھری غصیلی نگاہوں سے کھڑا سے دیکھتا رہا۔ اسے سمجھ نہیں آیا وہ اب کیا کہے۔

”اس لئے نہیں کہ میں ہاشم کے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ بلکہ دو وجوہات تھیں۔ پہلی، سارہ کبھی گواہی نہ دیتی۔ وہ خطرہ نہیں تھی۔ پھر بھی
میں ایک روز اس سے ملاتا تھا۔ تمہاری کشدگی کے تیسرے روز۔ اور میں نے اس کو اتنے اچھے طریقے سے دھمکایا (سعدی کی مٹھیاں بھینچیں) چہرہ
نہ ہوا) اور یہ کہا کہ سعدی مر چکا ہے اور اس کو اس کی بچیوں کی دھمکی بھی دی ساتھ یہ تسلی بھی دی کہ ہاشم کو نہیں بتاؤں گا اس کا نام.... کہ وہ کسی
لہجہ بھی بتانے کے قابل نہیں رہی۔ مجھے یقین ہے اس نے مجھ سے ملاقات کا تذکرہ اپنے فرشتوں سے بھی نہیں کیا ہوگا۔“ پھر گہری سانس
لی۔ ”دوسری وجہ! میں چاہتا تھا ہاشم تمہیں ماردے یوں ہر گواہ ختم ہو جاتا، لیکن اگر ہاشم کو یہ پتہ چلتا کہ ایک گواہ اور بھی ہے تو تمہیں مارنے کا
لامہ نہ ہوتا اور وہ تمہیں چھوڑ دیتا۔ دونوں گواہوں کو ایک ساتھ مارنا دانشمندی تھی ویسے بھی تم جو بھی سمجھو مجھے میں ایک کمزور بے قصور عورت کو
مارنے کے حق میں نہیں ہوں.... مجھے ایسے مت دیکھو۔ فارس کی بیوی نے ہماری باتیں سنی تھیں اس کا قصور تھا اور ڈی اے کو بھی تو ہر معاملے
میں ٹانگ اڑانے کی عادت ہے بے قصور وہ بھی نہیں تھی سو.....“

سعدی بچہ کر آگے بڑھا اور ایک مکار کھ کر اس کو لگایا، مگر خاور پھرتی سے بانیں طرف کو ہوا، سعدی کا مکاد یوار پہ لگا، اس سے پہلے کہ
وہ مڑتا، خاور نے کمال تیزی سے اس کے دونوں بازو پیچھے مروڑ کر اس کو دیوار سے لگایا اور اس کے کان میں غرایا۔

”تمہیں لڑنا نہیں آتا۔ تمہیں باتوں کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ ادھر مرنا ہے تو مرو۔ میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے کوئی دوسرا
طریقہ ڈھونڈ لوں گا۔ لیکن اگر میرے ساتھ آتا ہے تو دو دن کے اندر اندر مجھے بتاؤ۔ میری آفر محدود مدت کے لئے ہے۔“ وہ بازوؤں کے
مروڑے جانے پہ زور سے کراہا تھا۔ خاور نے ایک جھٹکے سے اسے چھوڑا اور دروازہ کھولتا تیزی سے باہر نکل گیا۔ سعدی اپنی دائیں کلائی پکڑے
ٹپے اور بے بسی سے گہرے گہرے سانس لیتا وہیں دیوار سے لگا کھڑا رہا۔ اس کے کان سرخ اور چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ پہلی دفعہ اسے اس قید
خانے میں اپنا آپ غیر محفوظ لگا تھا۔



بدن کو برف بناتی ہوئی فضا میں بھی..... یہ معجزہ ہے کہ دستِ ہنر بچایا ہے
انیکسی کے کچن میں ناشتے کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی تھی۔ صداقت بھاگ بھاگ کر سارے کام پھرتا پھر رہا تھا۔ شلوار قمیض کف والی
ہاتھ رکھی تھی اور کوئی خوشبو بھی لگا رکھی تھی شاید۔

کچن کی گول میز پہ دوپہر کے لئے سبزی کا مٹی ندرت نے نگاہیں اٹھا کر عینک کے اوپر سے اسے دیکھا۔ ”تمہارے گاؤں جانے میں
ابھی چار دن ہیں۔ ایسے بھاگ بھاگ کر کام کر رہے ہو جیسے شام کی ٹرین چھوٹنے والی ہو۔“

وہ شرمندہ ہو گیا۔ ”نہیں جی میں تو سوچ رہا تھا کہ.... سعدی بھائی ہوتے تو کتنی خوشی سے میری شادی میں شرکت کرتے۔“ جلدی
سے بات بنائی۔ پھر ندرت کی طرف پلٹا۔ ”پتہ ہے جی، میری گھر والی کے نانا بڑے اللہ والے ہیں میں نے ان سے سعدی بھائی کے لیے دعا

کردائی تھی۔ وہ کہتے ہیں باجی کہ اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد آسانی کرنے والا ہے۔“

”اور اگر سعدی یہاں ہوتا تو پتہ ہے کیا کہتا؟“ سبزی کا نئے انہوں نے مسکرا کر سر جھٹکا۔ لمبے بھر کے لئے منظر بدلتا گیا۔ ارد گرد دیواریں، فرنیچر، سب ڈھلتا گیا.....

چھوٹے باغیچے والے گھر کے لاؤنج میں رات کے وقت بتیاں جلی تھیں۔ ٹی وی شور مچائے بیٹھا تھا۔ ندرت ہاتھ میں ریموٹ پکڑے، اسامہ کو مسلسل خاموش رہنے کی تاکید کر رہی تھیں۔ ساتھ میں کبابوں کے آمیزے سے نکلیا بنا بنا کرڑے میں رکھتی جا رہی تھیں۔ اس آمیزے کو چکھنے کی جسارت کرنے والے اپنے تینوں بچوں کے ہاتھوں پہ باری باری ریموٹ مار کر ان کو پرے ہٹا چکی تھیں۔ (میری اولاد بجال ہے جو آٹھ بجے والے ڈرامے کے دوران خاموش رہے۔ پورے دن کے کام کاج کے بعد صرف ایک آٹھ بجے والا ڈرامہ دیکھتی ہوں میں، مگر نہیں۔ اتنا شور کرتے ہیں کہ حد نہیں۔) یہ الفاظ گالیوں اور لعن طعن سے سجا کر وہ بار بار ڈانٹتے ہوئے دہرا رہی تھیں۔ مگر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ حنہ پیر اوپر کر کے لیپ ٹاپ گھنٹوں پہ رکھے بیٹھی، ہیڈ فون چڑھائے، کسی کورین آئیڈل کا شو دیکھتی ہنستی جا رہی تھی۔ سیم اپنے ہوم ورک کی کتابیں پھیلائے مسلسل اونچی آواز میں سعدی سے باتیں کر رہا تھا جو صوفے پہ پیر لے کر کے لیٹا، کشن سر تنے رکھے، موبائل پہ لگا تھا اور ساتھ ساتھ اسامہ کو جواب بھی دے رہا تھا۔

”ہاں تو مسئلہ کیا ہے؟ ایک سورۃ کا ترجمہ یاد کرنے کو تو دیا ہے نیوشن نیچر نے۔ کر لو نا۔“

”بھائی، ابھی ہماری عمر تو نہیں ہے ترجمہ یاد کرنے والی۔“ وہ منہ میڑھا کر کے دہائی دے رہا تھا، غالباً کسی کلاس فیلو کی باتوں سے متاثر ہو کر کہہ رہا تھا۔ سعدی نے نظر اٹھا کر اسے ذرا سا گھورا، اور اسامہ فوراً ہل کر رانا لگانے لگا۔

”اور ہم نے آپ کے لئے آپ کے ذکر کو بلند کیا۔“

پس بے شک تنگی کے بعد آسانی ہے۔

بے شک تنگی کے بعد آسانی ہے۔

تو جب آپ فارغ ہوں تو عبادت میں محنت کریں۔

اور اپنے رب کی طرف دل لگائیں۔“

سیم یاد کر رہا تھا۔ ندرت جو تا بھی نہیں اٹھا سکتی تھیں، کہ قرآن پڑھ رہا تھا، بس تملتا کر کہنے لگیں۔ ”اندر جا کر پڑھ لو اسامہ۔ میرا ڈرامہ نکل رہا ہے۔“

مگر سعدی نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔ ”تنگی کے بعد آسانی ہے؟ تم سورۃ الانشراح کی اس آیت کو صحیح نہیں پڑھ رہے۔“

اب کے اسامہ اور خود ندرت نے بھی رک کر اسے دیکھا تھا۔ جنین نے ہیڈ فون کے باوجود سنا تھا، مگر بس سر جھٹک کر اسکرین کی طرف متوجہ رہی۔ (بس! اب شروع ہوا سعدی بھائی کا کوئی نیا فلسفہ۔)

”بھائی، یہ میرے پاس ترجمے میں لکھی ہوئی ہے۔“ سیم تو مائنڈ کر گیا تھا۔ سعدی نے گہری سانس لے کر موبائل پر سے رکھا اور اٹھ کر بیٹھا۔ بخیدگی سے ماں کو دیکھا (جو آدھی اس کی طرف باقی آدھی ٹی وی کی طرف متوجہ تھیں۔)

”تنگی کے بعد آسانی ہے؟ یہاں اللہ نے یہ نہیں فرمایا۔ ترجمہ غلط لکھا ہے۔ کچھ لوگ اس آیت کو نادانستگی میں غلط بولتے اور لکھتے ہیں۔“ ذرا سی سانس لے کر کہنے لگا۔ ”سورۃ الانشراح کی پانچویں آیت ہے، فان مع العسر یسر۔ پس بے شک تنگی کے ”ساتھ“ آسانی ہے۔ بعد نہیں، ساتھ!“

ندرت ڈھیلی پڑیں۔ ”ہاں تو ایک ہی بات ہوئی نا۔“ ناک سے مکھی اڑائی۔ اور اٹھ کر ٹی وی کے قریب والے صوفے پہ جا

نہیں۔ کبابوں کے آمیزے والی پرات اور خالی ٹرے بھی وہیں رکھ لی۔

”یہاں ایک بات نہیں ہے۔ ایک بات ہوتی تو یہاں اللہ ”مع“ (ساتھ) کے بجائے ”بعد“ کا لفظ استعمال کرتا، مگر اللہ کا قرآن اتنا پرفیکٹ ہے کہ حد نہیں۔ یہ دو آیات تو میری فیورٹ ہیں۔“

اور حنین یوسف نے (اُف) کراہ کر رخ پورا موڑ لیا۔ سعدی نے مایوسی سے اسے دیکھا اور پھر ماں کو جو نکلیاں بناتے ہوئے ٹی وی پر پھر رہی تھیں اور پھر سیم کی طرف چہرہ گھمایا جو واقعی متوجہ تھا۔ چلو، کوئی ایک تو متوجہ تھا۔ سعدی کو حوصلہ ملا۔ اہل قرآن کو کوئی سنتا نہیں، ورنہ وہ تو بول بول نہ تھکیں۔

”یہ آیت اس سورۃ میں دو دفعہ آتی ہے۔ ایک ساتھ۔ یعنی دہرائی گئی ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے سیم یہ کیوں دہرائی گئی ہے؟“ دبے دبے دوش سے وہ گھنگریا لے بالوں والا لڑکا مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”میری مس کہتی ہیں قرآن میں باتوں کو..... زور دینے کے لئے دہرایا جاتا ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔ تاکید کے لئے آیات دہرائی جاتی ہیں مگر ان دو آیات کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ ٹھہرو میں تمہیں پہلے یہ آیت سمجھاتا ہوں۔ فَاِنْ مَّعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ ”فَاِنْ“ کا مطلب ہے ”پس بے شک“، یعنی جو بات آگے بتائی جا رہی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ ”مع“ کا مطلب ہے ”ساتھ“۔ شادی کا رُز پ لکھا ہوتا ہے نا ”مع اہل و عیال“، یعنی گھر والوں کے ”ساتھ“ آئیں۔ یہ وہی ”مع“ ہے۔ تیسرا لفظ ”عسر“ ہے یعنی ”مٹنگلی“۔ پریشانی، مشکل، کٹھن حالات۔ چوتھا لفظ ہے ”یسرا“ یعنی آسانی۔ فَاِنْ مَّعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ پس بے شک..... ساتھ ہے..... مٹنگلی ہے... آسانی سمجھا آیا؟“

سیم نے اثبات میں سر ہلایا۔

”او کے۔ اب دیکھو۔ اگلی ہی آیت میں پھر ان الفاظ کو دہرایا جاتا ہے۔ اِنْ مَّعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ بے شک ہرنگلی کے ساتھ آسانی ہے۔ بات ختم۔ ہے نا؟ مگر نہیں۔ اللہ کا قرآن بہت امیزنگ ہے۔“ ذرا دیر کو مسکراہٹ دبا کر وقفہ دیا۔ حنین ہیڈ فون اتار کر گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی مٹی اور ندرت گو کہ ٹی وی کو بھی دیکھ رہی تھیں مگر آواز ہلکی کر دی تھی۔

”یہاں پر عربی زبان کا ایک دلچسپ اصول لاگو ہوتا ہے۔ تم لوگوں کو اسم معرفۃ اسم نکرہ کا تو پتہ ہے نا؟ عام چیزیں نکرہ ہوتی ہیں جیسے ”کا“ شہر مینار۔ مگر خاص چیزیں معرفہ ہوتی ہیں جیسے ”اسلم“ لاہور مینار پاکستان۔ پڑھا تھا اردو گرامر میں یا نہیں؟“ دونوں کو یاد دلایا۔ حنین ایک دم اُٹ۔

”پتہ ہے ہماری اردو کی ٹیچر کی انہی دنوں مٹنگلی ہو گئی اسم نامی بندے سے، بس ہم تو ان دنوں سارے جملے اسم کے بناتے تھے..... سو رہی آپ بات پوری کریں۔“ سعدی کی گھوری پہ وہ جلدی سے چپ ہوئی۔ وہ کہنے لگا۔

”عربی میں عام چیزوں کو خاص بنانے کے لئے ان سے پہلے ”ال“ لگایا جاتا ہے۔ جیسے انگریزی میں ”The“ لگاتے ہیں۔ اب ان آیت کو دیکھو۔ فَاِنْ مَّعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ یہاں خاص کیا ہے اور عام کیا ہے؟“

”العسر خاص ہے اور یسر عام ہے۔“ سیم جلدی سے بولا۔

”بالکل مٹنگلی ”خاص“ ہے اور آسانی ”عام“ ہے۔ اب یہاں لاگو ہوتا ہے عربی زبان کا ایک اصول۔ ”وہ نرمی سے مسکراتے ہوئے بتانے لگا۔“ ”عربی میں اگر ایک فقرے میں ایک خاص لفظ ہو اور ایک عام لفظ ہو اور وہ بات اگر اگلے ہی فقرے میں دہرائی جائے تو اس کا مطلب بدل جاتا ہے۔ یعنی دہرائے جانے کی صورت میں یہ سمجھا جائے کہ دوسرے فقرے میں جس خاص چیز کی بات کی جا رہی ہے وہ وہی پہلا فقرے والی ہے۔ مگر عام چیز پہلے فقرے والی نہیں ہے۔ عام چیز نئی ہے مختلف ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ دونوں الجھے تھے۔

”یعنی کہ دونوں آیات میں جس خاص چیز کی بات ہو رہی ہے وہ ایک ہی ہے۔ مگر جس عام (نکرہ) چیز کی بات ہو رہی ہے وہ دو

الگ الگ چیزیں ہیں۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھی۔“

سعدی نے گہری سانس لی۔ ”اگر یہ آیت ایک ہی دفعہ ہوتی تو اس کا مطلب ہوتا کہ ”بتنگی کے ساتھ آسانی ہے“ مگر دہرائے جانے کی صورت میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جس بتنگی کی بات دونوں آیات میں ہوئی ہے وہ ”ایک“ ہی ہے مگر اس کے ساتھ دو دفعہ جس آسانی کی بات ہوئی ہے وہ دو مختلف آسانیاں ہیں۔“

”مگر اس سے مطلب کیسے بدلا؟“ حد کو اب بھی نہیں سمجھ میں آیا تھا۔

”ایسے کہ بے شک ایک بتنگی کے ساتھ ایک آسانی ہے، پھر ”اسی“ بتنگی کے ساتھ ”ایک اور آسانی“ ہے۔ دونوں آیات میں ایک ہی بتنگی کی بات ہو رہی ہے، مگر ان کے ساتھ جڑی آسانیاں الگ الگ ہیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بتا رہے ہیں کہ لوگو! تم پر جب کوئی ایک مشکل آئی ہوئی ہے تو اس کے ساتھ ہم تمہیں ایک آسانی بھی دیتے ہیں، اور پھر ”اسی“ مشکل کے ساتھ ایک دوسری آسانی بھی دیتے ہیں۔ اس کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بلکہ دہرانے سے اس کا یہ مطلب بنتا ہے کہ مشکل ایک ہی ہوگی، مگر انسان کو اس کے ساتھ بار بار مختلف آسانیاں بھی ملیں گی۔ ایک مشکل، مگر کئی آسانیاں۔ ایک عسر، مگر ایک سے زیادہ یسر۔ ہم مشکل حالات میں انتظار کرتے ہیں کہ بھی بتنگی کے ”بعد“ آسانی آئے گی، مگر آسانی تو اللہ بتنگی کے ”ساتھ“ ہی دیتا ہے۔ ہم انسان مشکل کو دیکھتے اور اسی کو سوچتے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ عطا کردہ ڈھیروں آسانیاں بھول جاتے ہیں۔ قرآن کی ایک ایک آیت اتنی امیزنگ ہے کہ اس پہ غور کرنے کے لئے ساٹھ ستر سال کی زندگی بھی کم لگتی ہے۔ اگر ہم مسلمان فیس بک اور ٹی وی سے باہر نکلیں تو ہمیں وقت ملے..... اچھا اچھا میں آپ لوگوں کو نہیں کہہ رہا۔“ ساتھ ہی جلدی سے دونوں ہاتھ اٹھادیے، کیونکہ اسکرینز کے آگے جمی ماں، بہن جو پہلے توجہ سے سن رہی تھیں اب ایک دم آنکھوں سے انگارے اگلنے لگی تھیں.....

سبزی کا مٹی ندرت کی انگلی پہ کٹ لگا تو وہ چونکیں۔ منظر لمحے بھر میں بدل گیا۔ وہ انیس کے اوپن کچن میں بیٹھی تھیں اور ان کے ساتھ حد بیٹھی سوچتے ہوئے کچے مٹر اٹھا اٹھا کر منہ میں ڈال رہی تھی۔ ندرت نے زور سے اس کے ہاتھ پہ چپٹ لگائی۔

”ہزار دفعہ کہا ہے، ایسے مت کھایا کرو بے برکتی ہوتی ہے۔“

”مجھے پتہ ہے آپ کیا سوچ رہی ہیں۔“ وہ اثر لئے بغیر ان کو سنجیدگی سے دیکھ کر بولی تو ندرت نے بس بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ کب آکر بیٹھی، انہیں پتہ بھی نہیں چلا۔ ”اور مجھے پتہ ہے صداقت کی اس بات کو سن کر بھائی کیا کہتا۔ مجھے پتہ ہے آپ بھائی کو یاد کر رہی ہیں۔“ ”نہیں۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ وہ ٹھیک کہتا تھا۔“ سر جھٹک کر زخمی مسکراہٹ کے ساتھ آلو چھیلنے لگیں۔ ”ان دنوں میں ہر وقت سوچتی تھی کہ میرے ساتھ کتنا ظلم ہوا، ایک بھائی مارا گیا، دوسرا جیل میں ہے۔ میں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ میرے دو بیٹے تو میرے پاس تھے۔ جب سعدی.... جب سعدی نہیں رہا تو بھی میں نے یہ نہیں شکر کیا کہ فارس تو ہمارے پاس تھا۔ ہم اکیلے تو نہیں تھے۔ اب وہ بھی نہیں ہے۔ ناشکری نعمتوں کو گھٹاتی ہے۔“ وہ شاید خود سے بول رہی تھیں۔ ”مگر اب ہم سب کو مظلوموں والی خود ترسی سے نکلنا چاہیے۔ سعدی نہیں ہے، فارس نہیں ہے تو کیا ہوا۔ میرا ایک بیٹا تو ہے۔ ایک نکمی بیٹی تو ہے میرے پاس۔“

اور حنین جو بڑے پیار سے اور دکھی دل سے سن رہی تھی آخری الفاظ پہ تو مانو پٹنگے ہی لگ گئے۔

”ہاں بس“ میں یہی سوچ رہی تھی کہ آج امی نے پورا پیرا گراف بول دیا مگر میری برائی نہیں کی، طبیعت تو ٹھیک ہے، مگر بہت شکریہ

”جلی کروادی آپ نے میری!“ غصے سے تن فن کرتی وہ اٹھ گئی۔
 ندرت پیچھے سے مسلسل اس کو سخت ستا رہی تھیں۔ ”ایک ہفتے کی بات تھی، میرا سارا گھر الٹا کر رکھ دیا، کچھ بھی ڈھنگ سے
 صاف نہیں کیا، پھوہڑ لڑکی۔“



سنا یہ ہے کہ سبک ہو چلی ہے قیمتِ حرف سو ہم بھی اب قد و قامت میں گھٹ کے دیکھتے ہیں
 سوموار کی صبح شہر کی سڑکوں پہ کاروبار زندگی از سر نو شروع ہو چکا تھا۔ ریٹورانٹ میں ہلکا پھلکا رش تھا۔ ایسے میں اسامہ سیڑھیاں
 چڑھتا اوپر آیا اور اوپری ہال کا دروازہ کھولا۔

ہال کی شیشے کی دیوار سے نیچے سڑک پہ بہتا ٹریفک صاف دکھائی دیتا تھا۔ کھڑکی کے قریب ایک دیوار پہ چند کاغذات چسپاں
 تھے۔ ایک سیاہ کوٹ اور ٹائی والا نوجوان ان کاغذات کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک سیاہ کوٹ والی لڑکی بڑی میز کے کنارے بیٹھی
 چائے پیتے ہوئے سن رہی تھی اور سامنے کرسی پہ ٹیک لگائے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی زمر دیوار پہ لگی تصویروں کو دیکھ کر سوچتے ہوئے نفی میں
 سر ہلا رہی تھی۔ ”نہیں۔ یہ بھی نہیں۔“

”السلام علیکم!“ سیم نے پکارا تو زمر نے گردن موڑی، مسکرا کر اس کو قریب بلایا۔ وہ باقی دونوں دکلا، کو بھی سلام کرتا شرمیلی
 مسکراہٹ کے ساتھ زمر کے ساتھ آ بیٹھا۔

”آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟“

وہ بال باندھے سیاہ کوٹ میں ملبوس تھی۔ ناک کی سنہری نتھ دمک رہی تھی اور بھوری آنکھیں پر سوچ انداز میں دیوار پہ مرکوز کر رکھی
 تھیں۔ ”ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ قمر الدین مقتول کا قاتل ان سب لوگوں میں سے کون ہونا چاہیے۔“ سیم نے گردن موڑ کر ان تصاویر کو دیکھا۔
 ”قمری الدین کی گولڈ جیولری شاپ تھی۔ پیسے والا آدمی تھا۔ ٹگینوں کی غیر قانونی اسمگلنگ جیسے الزامات کے باعث جیل گیا تھا۔“ وہ
 نوجوان وکیل بتا رہا تھا۔ ”اس کو مارنے کے لئے بہت سے لوگوں کے پاس بہت سی وجوہات ہو سکتی تھیں۔“

اسامہ قدرے پر جوش ہوا۔ ”یعنی کہ ہم اصل قاتل ڈھونڈ کر پولیس کے حوالے کر دیں تو ماموں جھوٹ جائیں گے؟“
 وہ تینوں ایک دم سے اسے دیکھنے لگے۔ سیم قدرے جزبہ ہوا۔

”اصل قاتل کی پرواہ کسے ہے سیم؟ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ قاتل تک پہنچنا پولیس کا کام ہے۔“

”تو پھر ان لوگوں میں سے آپ لوگ قاتل کیوں ڈھونڈ رہے ہیں...؟“ وہ الجھا۔

”سیم، وہ لوگ فارس پہ جھوٹا الزام لگا رہے ہیں، ہمیں اس جھوٹ کا مقابلہ کرنا ہے۔“

”سچ کے ساتھ!“ وہ پھر سے پر جوش ہونے لگا۔

”نہیں سیم۔ کورٹ میں مقابلہ سچ کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ یہاں جھوٹ سے لڑا جاتا ہے اس سے بڑے جھوٹ کے ساتھ۔ الزام

سے لڑا جاتا ہے اس سے بڑے الزام کے ساتھ۔“

”یہ کورٹ ہے بیٹا!“ نوجوان وکیل مسکرا کر گویا ہوا۔ ”یہاں ایک سچ ثابت کرنے کے لئے ایک سو ایک جھوٹ بولنے پڑتے

ہیں۔“

”مطلب... اب ہمیں کیا کرنا ہے؟“ سیم نے پھر سے زمر کو دیکھا۔

”ہمیں کچھ بھی نہیں کرنا۔ برڈن آف پروف (عدالت کے سامنے ثبوت ڈھونڈ کر لانے کی) ذمہ داری استغاثہ پہ ہوتی ہے،

استغاثہ (پراسیکیوشن) وہ ہوتا ہے جو الزام لگاتا ہے۔ ملزم قانون کی محبوب اولاد ہوتا ہے۔ کسی ملزم کو قاتل ثابت کرنا بہت مشکل مگر اس کو بے گناہ ثابت کرنا آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ قانون ہر شک کا فائدہ ملزم کو دیتا ہے۔ ہم نے صرف بیٹھ کر پراسیکیوٹر کے الزامات سننے ہیں اور پھر... ان کے کیس میں رتی برابر شک پیدا کرنا ہے۔ جو گواہ وہ پیش کریں گے، ہمیں ان کو ڈس کریڈٹ کرنا ہے، ان کی عزت بھری پکھری میں مجروح کرنی ہے۔ جو ثبوت وہ پیش کریں گے، اس ثبوت کے اوپر اتنے شکوک و شبہات کا کیچڑ اچھالنا ہے کہ وہ دفن ہو جائیں، اور پھر ہمیں ایک اور suspect عدالت کے سامنے پیش کرنا ہے۔ کسی اور شخص پہ شک و شبہ ڈال کر اس پہ قاتل ہونے کا ان ڈائریکٹ الزام لگانا ہے وہ اتنا بڑا نہیں ہوگا کہ وہ دوسرا مشتبہ شخص گرفتار ہو سکے، مگر اتنا ضرور ہوگا کہ فارس کا مجرم ہونا مشکوک ہو جائے۔“

”مگر آپ نے کہا تھا کہ آپ کورٹ میں جھوٹ بولنے کے خلاف ہیں۔“ سیم کے چودہ سالہ مسلمان دل کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔

”میں، بلکہ ہر قانون کا احترام کرنے والا شخص پر جری کے خلاف ہوتا ہے۔ اللہ کی قسم اٹھا کر کٹھڑے میں کھڑے ہو کر جھوٹ بولنا یعنی پر جری کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ مگر وکیلوں کو ایسا کوئی حلف نہیں لینا ہوتا سو وکیل اپنے موکل کے دفاع کے لیے کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔“ ذرا سے شانے اچکا کر بولی۔ سیم نے باری باری ان تینوں کے مطمئن چہرے دیکھے اور پھر دیوار پہ لگی تصویروں کو۔

”Is That Right?”

”It's Legal.“ زمر نے پھر شانے اچکائے تھے۔ ”اگر ایک آدمی اپنی زندگی بچانے کے لئے اپنے اوپر حملہ آور شخص کو قتل کر دے تو اس کو سیلف ڈیفینس (دفاع ذات) کہتے ہیں جو قانوناً اور شرعاً گناہ نہیں ہے۔ زندگی انسانوں کے پاس اللہ کا سب سے قیمتی تحفہ ہے۔ اس کو بچانے کے لئے انسان اپنا ہر ممکن دفاع کرتا ہے۔ اور ہم یہی کر رہے ہیں۔ ہم فارس کے ڈیفینس لائزز ہیں۔ دفاعی وکیل۔“

اسامہ سے اب مزید ہضم کرنا مشکل تھا۔ جلدی سے کھڑا ہوا، زمر سے کار کی چابی لی، اور ڈرائیور لے جانے کی اجازت مانگی، اور نیچے بھاگ آیا۔ دونوں کانوں کو باری باری چھوتے (توبہ توبہ) وہ اب زینے اتر رہا تھا۔ نیچے کچن میں کچھ کھاتی حنین اس کی منتظر تھی۔ اسے حنہ کے ساتھ جانا تھا۔ حنہ کو مدد کی ضرورت تھی۔



میں وہ آدم گزیدہ ہوں جو تنہائی کے صحرا میں خود اپنی چاپ سن کے لرزہ بر اندام ہو جائے کلبو میں واقع اس زیر زمین تہہ خانے میں میری انجیو سعدی کے سامنے میز پہ کھانا رکھ رہی تھی، اور وہ کاؤچ پہ بیٹھا بازو سینے پہ لپیٹے کبھی کھانے کو دیکھتا، کبھی میری کو۔

”پہلے گارڈ سے کہو وہ اسے چکھے۔ پھر میں کھاؤں گا۔“

”ہم سب کھا چکے ہیں۔“

”پھر لے جاؤ یہ کھانا۔ مجھے کیا معلوم تم لوگوں نے اس میں کیا ملایا ہو۔“ برہمی اور قدرے اضطراب سے زمرے پر دھکیلی۔ میری متعجب رہ گئی۔ ”سب کے لئے یہی کھانا بنتا ہے تمہارے کھانے میں کیوں کچھ ملائے گا کوئی؟“

”پہلے کوئی اور چکھے گا تب میں کھاؤں گا۔“ وہ ضد کر رہا تھا۔

”پھر بیٹھے رہو اسی طرح۔“ خفگی سے بڑبڑا کر وہ باہر نکل گئی۔

سعدی نے کھانے کو نہیں چھوا۔ ویسے ہی بیٹھا رہا۔ کبھی سردوئوں ہاتھوں میں گرالیتا، کبھی بازو اپنے گرد لپیٹ لیتا۔

”میں ڈر گیا ہوں۔“ کچھ دیر بعد خاور کے کمرے میں زمین پہ بیٹھنے اس نے شگستگی سے اعتراف کیا تھا۔

خاور ایک کونے میں کھڑا لکڑی کے چھوٹے سے ٹکڑے کو جو اس نے دروازے کے کنارے سے اکھاڑا تھا دیوار پہ رگڑتا جا رہا تھا۔ اواز پہ لردن گھما کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے کے زخم اب بہتر تھے اور وہ پہلے سے تازہ دم لگتا تھا۔

”روز کھانا کھانے سے پہلے ڈرامہ نہ شروع کر دیا کرو۔ یہ ہمیں زبردے کرنہیں ماریں گے۔ ہاشم لاشیں دیکھنا چاہے گا ورنہ ان کو اٹھانا۔ گا۔ یہ کسی قدر قتی طریقے سے ہمیں ماریں گے۔“

سعدی نے نگاہیں اٹھا کر بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”یہ میری ہاشم سے بات نہیں کر رہا ہے۔“
 ”یعنی میرا اندازہ درست تھا۔ ہاشم لاعلم ہے۔“ وہ اب پھر سے لکڑی کا ٹکڑا دیوار سے رگڑنے لگا تھا۔ منہمک اور مصروف۔
 ”ہم کب نکلیں گے یہاں سے؟“ خاور نے چونک کر اسے دیکھا تو اس نے جلدی سے اضافہ کیا۔ ”اگر میں تمہارے ساتھ

”جب تم تیار ہو گے۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ خاور کے سامنے بالکل مد مقابل، اور گردن کٹا کر بولا۔ ”میں تیار ہوں۔“

خاور نے کڑی کانٹزا وہیں رکھا اور اس کی جانب مڑا۔ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، پھر ایک دم گھٹنا دہرا کر اس کے پیٹ میں

ایپ لہنی سے اس کے کندھے پہ ضرب لگائی اور پاؤں سے اس کے پہلو کو دھکا دیا۔ سعدی یکے بعد دیگرے ضربوں سے بے اختیار نیچے کو گڑا۔

ایپ نے پیٹ پہ دونوں بازو رکھے وہ درد سے چلایا تھا۔

”تم گھٹیا انسان.....“

مگر خاور نے اس کی طرف بازو بڑھایا۔ ”اٹھو۔ تمہیں باتوں کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ لڑنا تو بالکل بھی نہیں۔ اٹھو!“

”یہ کیا تھا؟“ سعدی نے اس کا ہاتھ نہیں تھا۔ دہرے ہو کر غصے سے اسے دیکھتا چیخا تھا۔

”میں تمہیں بتا رہا تھا کہ تمہیں کچھ نہیں آتا۔ اور لڑکیوں کی طرح مت روؤ۔ میں نے سادہ ملٹری ٹیکنیک سے تمہیں نیچے گرایا ہے۔

اٹھو۔ یہ کسی کو کیسے مارنا ہے۔ مار کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ کسی کو صرف گرانے یا بے ہوش کرنے کے لئے الگ طریقہ ہے۔ کسی کو امداد کرنے کا طریقہ اور ہے۔ اور قتل کرنے کا بالکل مختلف۔ اٹھو اور میرے سامنے کھڑے ہو۔ یہاں سے نکلنے کے لئے تمہیں جسمانی طور پر ضبط بننا ہوگا۔ ویسے بھی میں نہیں چاہتا کہ جب میں تمہیں قتل کروں تو تم کسی معصوم لڑکی کی طرح نظر آؤ بلکہ تمہیں کسی مرد کی طرح مقابلہ دینا پڑے۔ اٹھو میں تمہیں سکھاتا ہوں۔“

”تم سکھاؤ گے مجھے؟ میں تمہاری جان لے لوں گا۔“ وہ پھر کرکھڑا ہوا اور زور سے اس کو مکادے مارنا چاہا، مگر خاور نے بروقت اس کا ہاتھ تھام کر مروڑا۔

”آہ“ وہ آنکھیں بند کر کے کرا رہا۔ اسی کندھے پر کسی زمانے میں شیرو نے گولی ماری تھی۔
 ”تمہیں کچھ نہیں آتا۔“ اس کو پرے دھکیلا اور تاسف سے نفی میں سر ہلاتا کہنے لگا۔ ”تم تیار نہیں ہو۔ میرے ساتھ جانے کے لئے
 ”میں تیار ہونا پڑے گا۔ جاؤ کھانا کھاؤ اور سو جاؤ۔ کل صبح ناشتے سے پہلے میرے پاس آنا۔ پھر ہم تیار شروع کریں گے۔“ سعدی نفرت اور
 طعنے سے اسے دیکھتا دروازے کی طرف بڑھا۔

”اور سنو!“ کٹڑی کانٹراوا پس اٹھاتے ہوئے خاور نے یاد دلایا۔ ”مجھے کوئی شوق نہیں ہے تمہیں ساتھ لے جانے کا۔ اگر چلنا ہو تو تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔ ورنہ رہو یہیں اور مرو یہیں۔“ سعدی نے زور سے دروازہ دے مارنے کے انداز میں بند کیا اور باہر نکل گیا۔ کارڈ نے خاموشی سے اس کو دیکھا اور اسی طرح کھڑے رہے۔

یقیناً خاور نے اسے مارا تھا۔ گڈاویری گڈ۔



مرے شوق کی یہیں لاج رکھا!..... وہ جو طور ہے، بہت دور ہے! یونیورسٹی میں معمول کے مطابق رش تھا۔ راہداریوں میں بھانت بھانت کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایسے میں اسامہ کو باہر انتظار کرتا چھوڑ کر جنین تیز تیز ایک کاریڈور میں آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ ہیجان اور تذبذب کا آئینہ دار تھا۔ مگر چال مضبوط تھی، فیصلہ کن تھی۔ دفعتاً ایک دروازے کے قریب وہ رکی۔ نیم پلیٹ پڑھی۔ علوم الدین شعبہ تفسیر القرآن۔ اس نے وہ نام کئی دفعہ پڑھا اور پھر دروازہ کھٹکھٹا کر کھولا۔

اندر آفس میں وہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ میز کے پیچھے کرسی پہ براجمان، وہ عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرا کر انھیں۔ اور اس سے ملیں۔ کرسی پیش کی۔ جنین چپ چاپ بیٹھی۔ سر جھکا لیا۔ وہ اب سامنے جا بیٹھیں۔ ”سعدی کی کوئی خبر؟“ اور ایسے چند چھوٹے چھوٹے سوال کرتی رہیں۔ حنہ سر جھکائے جواب دیتی رہی۔ لب کاٹتی رہی۔ بہت دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور اپنی ٹیچر کی مہربان آنکھوں میں دیکھا۔

”میں بچپن میں بھائی کے ساتھ قرآن پڑھنے آپ کے گھر آتی تھی، آپ کے پاس ہی ہم دونوں نے آخری دس سپارے حفظ کیے تھے۔ آپ ہی نے ہمیں تفسیر پڑھائی تھی، بلکہ قرآن سکھایا تھا، مگر.....“ چند لمحوں کا وقفہ کیا۔ پرس نیچے رکھا۔ ٹیک لگا کر بیٹھی..... ذرا آرام دہ ہوئی اور ٹیچر کی آنکھوں میں دیکھ کر بتانے لگی۔ ”مگر میں کھوجکی ہوں۔ میں اپنی زندگی ضائع کر رہی ہوں۔ نہ میں قرآن یاد رکھ پائی، نہ میں آرگنائزڈ ہوں نہ نیک ہوں نہ نامم بنج کرنا سیکھ سکی۔ میں فجر میں اٹھ نہیں پاتی اور باقی نمازوں کے لئے دل نہیں چاہتا۔ گو کہ میری خواہش ہے کہ میں بھی پانچ وقت کی نمازی بن جاؤں، مگر..... یہ بہت مشکل بہت بھاری چیز لگتی ہے۔“

وہ خاموشی سے سن رہی تھیں اس بات پر تائید میں سر ہلایا۔ ”نماز بہت بھاری چیز ہے، واقعی!“

”مگر پھر وہ لوگ کون ہوتے ہیں جو منہ اندھیرے نیند توڑ کر اٹھتے ہیں اور ٹھنڈے پانی سے بھی خود کو بھگو لیتے ہیں مگر نماز نہیں چھوڑتے۔“ وہ بے چین ہوئی۔

”حنین... اللہ فرماتا ہے..... بے شک نماز بہت بھاری ہے سوائے ان لوگوں پر جو خشیت رکھتے ہیں۔“

”خشیت کیا ہوتا ہے؟“ اسے سارے اسباق بھول گئے تھے۔

”خشیت ڈر ہوتا ہے اور خشیت محبت ہوتی ہے، مگر نہ یہ صرف ڈر ہے نہ صرف محبت۔ یہ محبت بھرا ڈر ہوتا ہے جو انسان کو اپنے ماں باپ کا کہنا ماننے پہ مجبور کرتا ہے۔ صرف محبت میں ہم ان کی بات نہیں مانتے یا صرف ڈر کے باعث ان کی اطاعت نہیں کرتے۔ کوئی چھری تو نہیں دے ماریں گے نا وہ ہمیں۔ صرف یہ دھڑکا ہوتا ہے کہ ان کے اوپر ہمارا امپریشن نہ خراب ہو جائے، ہم ان کو دکھ دینے سے ان کی محبت کی وجہ سے ڈرتے ہیں۔ جس کے دل میں اللہ کے لئے ایسی خشیت ہوتی ہے، نماز اس پہ آسان ہو جاتی ہے۔“

”تو انسان اپنے اندر یہ خشیت کیسے پیدا کرے؟“

”تمہاری جگہ کوئی اور پوچھتا تو اس کے آگے لمبی تقریر کر سکتی تھی مگر تم حنین، تم پریکٹیکل زیادہ پسند کرتی ہو۔“ کہتے ہوئے وہ لیٹر پیڈ سے چند کاغذ علیحدہ کرنے لگیں۔ حنہ مسکرا دی۔ وہ درست جگہ آئی تھی۔

”یہ دو کاغذ لو۔“ انہوں نے دو کاغذ اس کے سامنے ڈالے اور پھر ایک سرخ اور ایک سبز قلم ان کے اوپر رکھا۔

”پہلے بائیں ہاتھ والے پہ ایک سرخ دائرہ کھینچو اور اسی سرخ رنگ سے اس کے اندر لکھتی جاؤ۔“

”کیا؟“

وہ رسان سے مسکرائیں۔ ”فون پہ تم نے کہا تھا کہ تم نے بہت سی ایڈکشنز (لت) چھوڑی ہیں مگر تمہارا ہر مسئلہ اس لئے ہے کہ تم فجر پہ نہیں اٹھتی۔ اب اس کا غذ پہ لکھو کہ جب تم فجر نہیں اٹھتی تو تمہیں کیا ملتا ہے؟“

حنین نے الجھ کر سوچا۔ پھر لکھنے لگی۔

”تھوڑی سی مزید نیند۔ بہت سارا سنبون۔ گرم گرم بستر۔ چند مزید خواب۔ پلیوور۔“ سر اٹھایا۔ ”اب؟“

”اب اس کے ساتھ لکھو کہ تم اس وقت.... یوں سوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو کیسی لگتی ہو؟ تمہارا کیا امپریشن جارہا ہوتا ہے اللہ کے سامنے؟“

لمحے بھر کے لئے حنین کے اندر کچھ ہلا۔ اس نے سر جھکایا۔ سرخ دائرے کو دیکھا۔ پھر لکھنے لگی۔

”اس وقت میں اللہ کے سامنے کیسی نظر آ رہی ہوتی ہوں؟“

ایک غافل لڑکی جو سو رہی ہے۔ جو نشیمن کی طرح سو رہی ہے۔ جو روز قیامت سے بے خبر ہے جس کو اپنے بنانے والے کے سامنے جاتے اپنے امپریشن کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اس کا ہاتھ کا پنا لکھتی گئی۔ ”جنت کی نہریں، جہنم کی آگ.... اسے نہ کسی پہ یقین ہے نہ ان کا احساس ہے۔ اللہ کی طرف سے اسے بار بار پکارا جا رہا ہے مگر وہ ڈھٹائی سے غرور سے سو رہی ہے۔ نماز پڑھنا اس کے نزدیک ایک حقیر کام ہے۔ اگر حقیر نہ ہوتا تو وہ اٹھ جاتی۔ وہ اللہ کی نافرمان نظر آ رہی ہے۔ فرشتے اس کے بارے میں یہی جا کر اوپر بتائیں گے کہ فجر پہ اسے سوتا پایا۔ اس کی ”اوپر“ والوں میں نہ کوئی قدر ہوگی نہ عزت۔ وہ بھٹکے ہوؤں میں سے ہے۔ اسی طرح غافل سوتی، جاگتی کسی دن مرجائے گی اور رحمت کے فرشتوں کو اس سے کوئی ہمدردی نہ ہوگی کیونکہ انہوں نے ہمیشہ اسے سوتے پایا ہے۔“ اس سے مزید نہیں لکھا جا رہا تھا۔ ”اور پھر سارا دن وہ سست اور بے زار رہتی ہے۔ اس کا ہر کام بے برکتا ہے۔ اس کا دل گلٹ سے بھر چکا ہے مگر اس گلٹ کو نکالنے کے لئے بھی وہ کچھ نہیں کرتی۔ اس کے اندر کوئی خیر نہیں ہے۔ جب وہ اللہ سے دعا مانگے گی تو کیا اللہ اس کی دعا قبول....؟“ بس بہت ہوا۔ اس نے قلم چھوڑ دیا۔ دل پہ بہت زور سے لگی تھی۔ صفحہ الٹا کر کے میز پہ رکھ دیا۔ سر ابھی تک جھکا تھا۔

”اب اس دوسرے صفحے پہ سبز دائرہ کھینچو۔“ حنہ نے ذرا سے توقف کے بعد دوسرا صفحہ اٹھایا۔ اور سبز دائرہ کھینچا۔ انگلیوں میں لرزش تھی۔

”اس پہ لکھو کہ فجر پڑھنے کے لئے تمہیں کیا کچھ کھانا پڑتا ہے۔“

وہ سر جھکائے لکھنے لگی۔

”نیند تو نا۔ گرم بستر چھوڑنا۔ سردی میں ہاتھ روم تک جانا، پانی سے خود کو بھگوننا، اور پانچ.... دس منٹ کی نماز پڑھ کر واپس آنا۔“ وہ رک گئی۔

”اور اب یہ لکھو کہ جب تم یہ کرو گی تو اللہ کے پاس تمہارا کیا امپریشن جائے گا؟“ وہ ذرا سی چونکی۔ پھر صفحے کو دیکھا۔ سبز دائرہ چمک رہا تھا۔ وہ ہناسوچے لکھنے لگی۔

”اللہ کو اس وقت میں کیسی لگوں گی؟“

وہ ہر پچھلی بات منادے گا۔ میں اس کے سامنے ایک ایسی لڑکی ہوں گی جو اپنا آرام چھوڑ کر اس کی پہلی پکار پہ اٹھتی ہے۔ جو اس کی بات مانتی ہے۔ اس کو قیامت کا احساس ہے اس کو جہنم اور جنت کی پرواہ ہے۔ وہ غافلوں میں سے نہیں ہے۔ ٹھیک ہے اس میں بہت برائیاں ہوں گی، مگر فرشتے جب فجر اور عصر کے وقت اوپر جائیں گے تو اس کا اچھا ذکر کریں گے اللہ کے سامنے.... اوپر والوں میں اس کا نام عزت سے

لیا جائے گا۔“ اس کے لکھنے میں روانی آگئی تھی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”وہاں اس کا امپریشن اچھا جائے گا۔ اس کی بہت سی غلطیوں سے صرف نظر کر لیا جائے گا۔ وہاں اس کی قدر ہوگی۔ اللہ اس کی تعریف کرے گا۔ جب وہ فجر کے لئے اٹھے گی اور دوسروں کو بھی اٹھائے گی تو اللہ بھی اوپر والوں کے سامنے اس کی تعریف کرے گا۔“ اس کا دل بھر سے بھرا آیا۔ لبوں پہ ہاتھ رکھ کر خود کو قابو کیا۔ ”اس کا دل گلت سے پاک ہوگا۔ اللہ اس کی تعریف کرے گا۔ اس کے کاموں میں برکت ہوگی۔ اللہ اس کی تعریف کرے گا۔ اللہ اس کی تعریف کرے گا۔ وہ اس کو اپنے پاس“ نماز پڑھنے والوں“ میں لکھ لے گا۔ اللہ اس کی تعریف کرے گا۔“ وہ ایک فقرہ اتنا قیمتی اور اتنا اندر تک ہلا دینے والا تھا کہ وہ اس کو بار بار پڑھتی گئی یہاں تک کہ دائرہ بھر گیا۔

ٹیچر نے میز پر دستک دی تو اس نے گہری سانس لی۔ نمی اندر اتاری اور کاغذ الٹا کر کے میز پر ڈال دیا۔

”اب ان دونوں کا غنڈ کو اپنی الماری پر.... یا بیڈ کے اوپر دیوار پہ کہیں بھی لگا لو اور دن میں نیس دفعہ لازمی ان باتوں کو پڑھو حتیٰ کہ یہ تمہارے دل میں بیٹھ جائیں۔ زندگی میں جب بھی کسی ایڈکشن کے ہاتھوں پریشان ہو فوراً دو دائرے بناؤ، اور ایک میں لکھو کہ ذرا سی تسکین کے لئے یہ کام کرتے وقت میں اللہ کو کیسی لگتی ہوں گی؟ اور دوسرے میں لکھو کہ اگر یہ چھوڑ دوں تو اس کو کیسی لگوں گی؟“ وہ رکیں۔“ مگر نماز کی عادت بنانے کے لئے تمہیں کچھ اور بھی کرنا ہوگا۔“

”کیا؟“ وہ تیزی سے بولی۔ اس وقت اندر سے اتنی ہل چکی تھی کہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔

”تمہیں یہ سمجھنا ہوگا کہ نماز ہے کیا؟“ وہ پرسکون سی پیچھے ہو کر بیٹھی کہہ رہی تھیں۔ ان کی نرم آنکھیں حنہ کے چہرے پہ جمی تھیں۔ ”نماز پہ آپ کو الارم کلاک نہیں اٹھانی۔ آپ کا ایمان اٹھاتا ہے۔ پچھلے دن اگر جھوٹ بولے ہیں، خیانت کی ہے، وعدہ خلافی کی ہے یا غیبت کی ہے تو اگلے روز فجر پہ اٹھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔“

”میں کچھ دن نماز بہت اچھی پڑھتی ہوں، پھر کچھ دن چھوڑ دیتی ہوں۔ ایک فیز سے نکل کر دوسرے فیز میں چلی جاتی ہوں۔ ایسا

کیوں ہوتا ہے؟“

”ہم مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نیت کی اہمیت نہیں سمجھتے۔ نماز میں دل کا سکون ہے، مگر یہ دل کے سکون کے لئے نہیں پڑھی جاتی۔ جو اس لئے نماز پڑھتا ہے کہ اس کو پڑھ کر وہ خود کو مطمئن اور پرسکون محسوس کرتا ہے وہ سخت فتنے میں مبتلا ہے کیونکہ وہ اپنے ”دل“ کے لئے نماز پڑھتا ہے اللہ کے لئے نہیں۔ ایسے ہی لوگ phases میں مبتلا رہتے ہیں۔ کچھ دن نماز پڑھی پھر کچھ دن نہیں پڑھی کیونکہ دل کو جو مرہم لگانا تھا لگ گیا۔ اب ضرورت نہیں ہے۔ وہ اسی لیے کچھ دن بعد نماز چھوڑ دیتے ہیں کہ اب ان کو ضرورت نہیں رہی، اب وہ پرسکون ہیں۔ پھر جب تک پریشان نہیں ہوتے، نماز کے قریب نہیں جاتے۔ نماز پڑھ کر ہمیشہ سکون نہیں ملتا تو اگر کیا سکون نہ ملے تو چھوڑ دیں ہم نماز پڑھنا؟ داغ لگوانے میں شفا ہے۔ داغ لگوانا سمجھتی ہونا؟ جیسے کوئی کاری زخم لگے تو قدیم قوموں میں اور اب بھی چین جاپان بلکہ پاکستان میں بھی.... سلاخ گرم کر کے اس جگہ کو داغا جائے تو زخم ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اس میں شفا ہے مگر ہماری امت کے لئے یہ منع ہے۔ تو جو لوگ نماز کو ایکسٹریما سے تشبیہ دیتے ہیں ان کو سوچنا چاہیے کہ اگر اللہ نماز میں شفا نہ رکھتا بلکہ تکلیف رکھتا تو کیا ہم اسے نہ پڑھتے؟ نماز کو اپنا دل مطمئن اور خوش کرنے کے لیے نہ پڑھا کرو۔“

”تو پھر ہم کیوں پڑھتے ہیں نماز؟“ اس نے نکتہ اٹھایا۔

”کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ دی اینڈ۔ فل اسٹاپ۔ ہم اسے اس لئے پڑھتے ہیں تاکہ اللہ راضی رہے ہم سے ہمارا امپریشن اس کے سامنے اچھا جائے۔ اور اگر ہمارے دل میں یہ ”نشیعیت“ ہو تو یہ بہت آسان ہے۔“ وہ ذرا دیر کو بھڑکی۔ ”مگر یہ تو ہو گیا کہ ہم نماز کیوں پڑھتے ہیں۔ اب یہ دیکھو کہ نماز بذات خود ہے کیا؟“ منین غور سے سن رہی تھی۔ وہ نرمی سے کہے جارہی تھیں۔ ”نماز تمہارے خیال میں کیا ہے؟“

وہ چپ رہی۔ اس کے پاس بہت سے جواب تھے مگر کوئی تسلی بخش نہ تھا۔



وہ لمحہ شعور جسے جان کنی کہیں..... چہرے سے زندگی کے نقابیں الٹ گیا یوسف خاندان میں سے کسی نے کاردارز کی نیو ایئر ایو میں شرکت نہ کی جو اس سردرات ان کے لان میں منعقد تھی۔ جنین اپنے کمرے میں بیٹھی کھڑکی کی طرف سے منہ موڑے بے تحاشہ کاغذوں پہ بنے دائروں کو بھرتی گئی۔ وہ خوش نہیں تھی، مگر وہ مطمئن تھی۔ زمرد کی تیاری کرتی رہی۔ اسامہ جلدی سونے چلا گیا۔ ندرت کی رات کی نماز اور وظیفے ابھی جاری تھے۔ غرض ان کا پورا گھر خاموش تھا، مگر باہر ”دنیا والے“ کاردارز کے لان میں جشن منانے میں مصروف تھے۔

وہاں گویا رنگ و بو کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ غبارے، قمقمے، بتیاں۔ پارٹی کا انتظام اندر تھا، مگر بارہ بجے کے قریب سب لمبے لمبے کوٹ اور جیکٹس پہنے باہر نکل آئے تھے جہاں فائروکس کا اہتمام تھا۔

ایسے میں شہرین اندر ایک کونے میں بیٹھی، مشروب کے گلاس پہ گلاس پہنے جا رہی تھی۔ سرخ ساڑھی میں ملبوس، وہ بے رونق اور تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ دفعتاً اس نے سر اٹھایا تو اوپر سیڑھیوں پہ شیر و کھڑا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ شہری نے سوتے ہوئے چہرے کے ساتھ مسکرا کر ہاتھ ہلایا، مگر وہ ایک اچھتی ہوئی نظراس پہ ڈال کر زیے اترنے لگا۔ لاؤنچ تقریباً خالی تھا۔ سب باہر تھے۔ نوشیرواں بھی باہر نکل آیا۔ سردی کے باعث جیکٹ کے کالر کھڑے کر لئے۔ اونچے برآمدے میں کھڑے اس نے ایک ویران نظریں نیچے سبزہ زار پہ شور مچاتے، ہنستے مسکراتے لوگوں پہ ڈالی۔ اس کی نگاہیں ایک ایک کا چہرہ کھوجتی رہیں، پھر سر جھٹک کر وہ دوسری سمت آیا، اور ایک ملازم کو اپنی کار نکالنے کا کہا۔

”سر آپ اس وقت کہاں...؟“

”زیادہ بک بک نہ کرو میرے سامنے۔ تم ہو کون ہاں؟“ اس کو گھورتے ہوئے غرایا۔ ”جو کہا ہے وہ کرو۔“ ملازم جلدی سے حکم بجالایا اور ازلی بے زار شیر و کار لے کر باہر سڑکوں پہ گم ہو گیا۔

رات ابھی جوان تھی۔ لان میں بہت سے لوگوں کے درمیان کھڑی سرخ میکی میں ملبوس جو اہرات کسی بات پہ مسکرا رہی تھی۔ کندھوں پہ سفید منک کوٹ ڈالے، وہ گردن اٹھا کر مسکراتے ہوئے آسمان پہ نظر آتے فائروکس دیکھ رہی تھی جب احمر اس کے قریب آ کر کھٹکھٹا۔ اس نے گردن موڑی، احمر کو دیکھ کر مسکرا ہٹ گہری ہوئی، پھر اس کا بازو تھا مے ایک طرف چلتی آئی۔

”اتنی پولیٹیکل گید رنگ مسز کاردار؟ اور آپ نے کہا تھا کہ آپ سیاست میں قدم نہیں رکھنا چاہتیں۔“ وہ اب برآمدے میں کھڑا اشکوہ کر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب کھڑی تھی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ نیچے روشنی تھی۔ یہاں کھڑے وہ دونوں کوئی تاریک سائے لگ رہے تھے۔

”میرے پاپا ایک سیاست دان تھے، میرے دادا دو بار گورنر رہے تھے، میں پھر بھی اس میدان سے دور رہوں گی، لیکن ہارون کی دوستی میں یہ سب کرنا پڑتا ہے۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ”اس سفید شال والی خاتون کو پہچانتے ہو؟“ ابرو سے نیچے مہمانوں کی طرف اشارہ کیا۔ احمر نے اس طرف گردن گھمائی۔ وہاں چند اصحاب کے ساتھ ایک سفید شال والی عورت کھڑی بات کر رہی تھی۔ وہ شکل سے پہچان لگتی تھی۔

”ان کو کون نہیں پہچانتا؟“

”گڈ!“ چمکتی آنکھوں سے احمر کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اس کو تباہ کر دو احمر۔ تمہارے پاس ایک مہینہ ہے، اس کے اتنے اسکینڈل

لیک کر، کہ وہ استعفیٰ دینے پہ مجبور ہو جائے۔“

ایک لمحے کے لئے احمر بالکل سنائے میں رہ گیا۔ آسمان پہ بلند آواز میں پٹاخوں کے ساتھ آتش بازی ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

”مسز کاردار وہ کوئی عام عورت نہیں ہے۔ اس کا بھی سیاسی خاندان ہے۔ آپ جتنی امیر آپ جتنی طاقتور ہے۔ اس سے دشمنی مول لینے کا کیا فائدہ؟ کل کو وہ ہم پہ جوابی حملہ کرے گی۔“

”اور تب تم ہو گے ناہر حملے کا جواب دینے کے لئے۔ اس نے ایک پارٹی میں ہارون سے مس بیہو کیا تھا۔ میں ہارون پہ احسان کرنا چاہتی ہوں۔ گیٹ ٹو درک۔ ایک مہینہ ہے تمہارے پاس!“ اس کا شانہ تھپتھا کر وہ مسکراتی ہوئی، میکسی سنبھالتی زینے اترتی گئی۔ احمر بے یقینی سے کھڑا رہ گیا، پھر چونکا جب ساتھ کوئی آکھڑا ہوا۔

”تم میں کاردارز کے لئے اتنے بڑے کام کرنے کی ہمت نہیں ہے تو آگاہ کر دینا، میرے پاس ملازموں کی کمی نہیں ہے۔“ سردمہری سے کہہ کر ہاشم نے ایک تند نگاہ اس پہ ڈالی اور پھر زینے اتر کر لان کی طرف بڑھ گیا۔ احمر کو پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ رات کتنی سرد تھی۔



ڈرا رہا ہے مسلسل یہی سوال مجھے گزار دیں گے یونہی کیا یہ ماہ و سال مجھے سرما کی اس دوپہر کو روم میں معمول کی سماعت جاری تھی۔ جج صاحب سمیت تمام افراد توجہ سے کٹھنرے میں کھڑے وردی والے پولیس اہلکار کو سن رہے تھے جو پراسیکیوٹر کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ کھٹا کٹ ٹائپ ہونے کی آواز بھی پس منظر میں سنائی دیتی تھی۔

”اور جتیس بور کا پستول فارس غازی سے برآمد کیا گیا، وہ آپ کی موجودگی میں برآمد کیا گیا؟“ پراسیکیوٹر نے کہتے ہوئے گردن پھیر کر دفاع کی میز کو دیکھا۔ جہاں زم قلم گھماتے ہوئے آرام دہ سی بیٹھی سن رہی تھی اور ساتھ بیٹھا فارس چبھتی ہوئی نظریں گواہ پہ جمائے ہوئے تھا۔

”جی۔ میں اس وقت اے ایس پی سردشاہ کے ساتھ موجود تھا۔“ گواہ کہہ رہا تھا۔

(سردشاہ سمیت چند گواہوں کو پراسیکیوٹر نے give up کر دیا تھا۔)

”پھر کیا ہوا؟“

”مجھے محر نے اس رات ایک سربہ مہر پارسل میں وہ پستول دیا جو میں نے پوری حفاظت اور ذمہ داری سے فارنزک لیب میں بھجوا دیا۔ لیب کے رزلٹ کے مطابق وہی پستول قمر الدین کے قتل میں استعمال ہوا تھا۔“

پراسیکیوٹر نے نیچے اتر آیا اور زم کو دیکھ کر ”آپ اگر جرح کرنا چاہیں!“ کہتا واپس اپنی کرسی پہ جا بیٹھا۔ (جس کا گواہ ہوتا ہے پہلے وہ سوال کرتا ہے پھر دوسرا کیل اس گواہ پہ جرح کرتا ہے۔) وہ گہری سانس لے کر انٹرویو اور بنجیدگی سے کٹھنرے کے سامنے نیچے آکھڑی ہوئی۔

”فارس غازی کو کس روز گرفتار کیا گیا تھا؟“ سپاٹ لہجے میں پوچھنے لگی۔

”13 اکتوبر کی شام۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔“

”اور پستول کب برآمد ہوا؟“

”اسی وقت۔“

”اور آپ نے اسے لیب میں کب بھیجا؟“

وہ لمبے بھر کو چپ ہوا۔

”اگلی دوپہر۔“

”اسی دن کیوں نہیں؟ ورک آٹھیکس کے مطابق آپ کو وہ پارسل اسی وقت لیب کو بھیجنا تھا۔ آپ نے وہ سولہ گھنٹوں بعد بھیجا۔“
 ”اے! جب کہ آپ کی برآمدگی کے وقت لیب کھلی تھی۔“
 ”مجھے ضروری کام سے گھر جانا تھا۔ اس لئے میں نے اس کو لا کڈ دراز میں ڈالا اور سوچا کہ صبح آکر....“ مگر زمر نہیں سن رہی تھی۔ وہ
 لی صاحب کی طرف مڑی۔

”یور آئر دفاع یہ چاہتا ہے کہ آپ پراسیکیوشن Exhibit ایف یعنی اس گن کو ڈسکوری میں سے خارج کر دیں۔ یہ ایسا ثبوت نہیں
 ہے۔ نوٹک دشبے سے پاک ہو۔“
 ”آپ چیکنش یور آئر۔“ پراسیکیوٹر فوراً اٹھا۔ ”دفتری کاموں میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔ یہ گن فارس غازی سے ملی ہے اس بات کے
 گواہ موجود ہیں۔“

”اس بات کے صرف دو گواہ تھے۔ سرد شاہ کو پراسیکیوشن گیواپ کر چکی ہے، اور ان صاحب کی کریڈیٹلٹی مشکوک ہے۔“ وہ دونوں
 ایک ساتھ تیز تیز بولنے لگے تھے۔ جج صاحب نے دونوں ہاتھ اٹھا کر زور زور سے خاموش کہا، پھر ہتھوڑا زور سے بجایا۔ وہ دونوں چپ
 ہوئے۔

”مسز زمر.... پراسیکیوٹر صاحب کا پوائنٹ درست ہے۔ دیر سویر ہو جاتی ہے۔ ہم اس ثبوت کو ڈسکوری سے نہیں نکال سکتے۔“
 زمر کی آنکھوں میں استعجاب ابھرا۔ باری باری اس نے پراسیکیوٹر اور جج کو دیکھا، پھر سر کو خم دے کر خاموشی سے واپس آکر بیٹھی۔
 فارس نے قدرے تعجب سے اس کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔ ”تم نے بحث کیوں نہیں کی؟“
 ”جج ان کا ہے۔“ وہ شدید ڈسٹرب نظر آ رہی تھی۔ فارس ”اچھا“ کہہ کر واپس پیچھے ہو کر بیٹھا۔ وہ اب بھی پرسکون لگتا تھا۔



اسی کے دم سے تو قائم ابھی ہے تار نفس..... یہ اک امید کہ رکھتی ہے پُر سوال مجھے
 ملاقاتی بوتھ میں کرسی کے اوپر فارس آکر بیٹھا تو شیشے کے پار براجمان لڑکی کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ زمر کی توقع کر رہا تھا مگر وہ سرخ
 اسکارف میں لپٹے چہرے اور نیچے لمبے وائٹ کوٹ میں ملبوس آبدار تھی۔ بلی جیسی سرمئی، چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھتی وہ مسکرائی۔
 ”سلام!“

فارس نے ذرا کی ذرا نظر گھائی۔ کمرے میں جابجا ایسے ہی بوتھ قطار میں لگے تھے اور ایک دن میں ہزار سے اوپر قیدی اپنے رشتے
 داروں سے ملاقات کرتے تھے۔

”میں الگ کمرے میں بھی مل سکتی تھی مگر ایسے سوالات زیادہ اٹھتے۔“ وہ سرمئی آنکھیں فارس پہ جمائے رساں سے بولی تھی۔ فارس
 نے گہری سانس لی، ذرا سا آگے کو جھکا۔

”میرا کام کرنے کا شکریہ!“ دہلی آواز میں بولا۔ خاور کو کس نے غائب کروایا ہے، اسے اب کوئی شک نہیں رہا تھا۔
 ”میں نے آپ کا کام نہیں کیا، اس نے میرے ہاتھ سے کاغذ چھینا تھا۔ میں تب بھی غیر جانبدار تھی اب بھی ہوں۔“ وہ دھیمی آواز
 میں کہہ رہی تھی۔

”پھر آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟“ اس کا لہجہ خشک ہو گیا۔

آبی نے ایک نظر اس کے چہرے پہ ڈالی۔ ”ملکہ نے دونوں قیدیوں کے سر قلم کرنے کا حکم جاری کیا ہے۔“
 وہ ایک دم بری طرح چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ گویا سانس تک رک گیا ہو۔

”مجھے افسوس ہے، میں ان کے لئے مزید کچھ نہیں کر سکتی۔ نہ پرانے قیدی کے لئے، نہ نئے قیدی کے لئے۔ میں نے کہا ہے کہ، اس سے ملاقات تک اس کو نہ مارا جائے، مگر وہ چند دن سے زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔“

”وہ اسے نہیں مارے گا۔“ اس نے سختی سے کہا تھا۔

’فارس غازی!‘ ”وہ“ اس حکم سے اس کی تکمیل تک بے خبر رہے گا۔ یہ حکم اس کی ماں نے دیا ہے۔ خیر، میرا کام تھا بتانا اس سے کہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ آپ کچھ کر سکتے ہیں تو کر لیجئے۔“

فارس نے پلکیں اٹھا کر غمی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ان میں شدید غصہ اور برہمی تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ ذرا نرم ہوئی۔ ”آپ جیل میں ہیں، کچھ نہیں کر سکتے۔ مگر آپ ملزم ہیں۔ مقیم فرزند نازنین قانون است۔ (ملزم قانون کی محبوب اولاد ہوتا ہے۔) باہر نکلے اور اسے خود پچائیے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی۔“ سرگوشی میں کہا، ”اٹھ گئی۔“

اسی پل پیچھے سے زمر آتی دکھائی دی۔ اور اگلے ہی پل وہ ٹھٹکی۔ سرخ اسکارف والی لڑکی فارس کے سامنے بیٹھی تھی۔ فارس نے دبی زبان میں کچھ کہا (مجھے کچھ دن دو۔ کچھ دن کے لئے ان کو نالو) جو زمر کو وہاں سے سنائی نہ دیا۔ لڑکی نے اندر سے اچکائے اور مزگئی۔ زمر کے ابرو بچھے۔ آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔ وہ لڑکی کی چھوڑی جگہ پہ آ بیٹھی۔

”یہ کون تھی؟“

وہ نگاہیں جھکائے سوچ میں گم تھا۔ منھیاں بھیج رکھی تھیں۔ پشاور کی چیل میں مقید پیر کا انگوٹھا مسلسل ہل رہا تھا۔ وہ پریشان تھا مضطرب تھا، مگر ضبط سے بیٹھا تھا۔

”میں پوچھ رہی ہوں یہ کون تھی؟“ اب کے وہ درمیانی شیشہ کھٹکھٹا کر زیادہ درشتی سے بولی تھی۔ فارس نے آنکھیں اٹھائیں، ایک سپاٹ اچنتی نظر اس پہ ڈالی۔

”میری پرانی گرل فرینڈ تھی، کوئی مسئلہ ہے آپ کو؟“

زمر کو اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ جڑے بچھے اور آنکھوں میں ناگواری عود آئی۔ بنا کچھ کہے سیدھی ہو کر بیٹھی اور خشک انداز میں بات کرنے لگی۔ فارس اسی طرح بیٹھا رہا۔ سُن پریشان، شل بے چین۔

نبیل سے نکلنے اور سعدی کے اغوا کے بعد سے اب تک اس کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا تھا۔ سب پلان کے مطابق ہوتا تھا۔ گرفتاری غیر متوقع تھی مگر وہ اس کی تیاری پہلے کر چکا تھا۔ صرف ایک یقین دہانی تھی کہ ہاشم سعدی کو نہیں مارے گا۔ یہ یقین دہانی بہت مضبوط، بہت پختہ تھی۔

مگر آج وہ نہیں رہی تھی اور وہ بالکل شل بیٹھا تھا۔



وہ شہر ہجر عجب شہر پر تھیرا تھا۔ بہت دنوں میں تو آیا تھا خیال مجھے کولمبو میں اس اونچے ہوٹل کے اندر تہہ خانے میں میری بچن میں سبزی کاٹ رہی تھی جب گارڈز اس کے پاس آئے اور اسے ہم کہا۔ وہ حیران سی ان کو دیکھنے لگی۔ پھر ان کے ساتھ چل پڑی۔ سکیورٹی چیک پوائنٹس سے گزر کر وہ لفٹ میں داخل ہوئے جو ہوٹل کے کچن لیوینئر میں رکی۔ جب کسی کو آنا جانا ہوتا تو ہیڈ شیف لینئر کی کوخالی کرا کے وہاں پہریداری پہ کھڑا ہو جاتا تھا۔ لینئر کی دیوار کے اندر پہنچنے کے لئے وہاں کسی کو معلوم نہ تھا۔

میری کو جب بچپن سے گزار کر وہ دونوں اوپر لے جا رہے تھے تو وہ گردن موڑ موڑ کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں حیرت اور تعجب تھا۔ اسے جہاز سے آنکھوں پہ پٹی باندھ کر (”بلا سنڈ فولڈ“ کر کے) لایا گیا تھا اور اتنے ماہ بعد وہ بالآخر اتنی روشنی دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اسے ایک کمرے میں لے آئے۔ میری ہچکچاتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ پر تعیش طریقے سے آراستہ سنہری تھیم میں سجا کر تازہ پھولوں کی مہک میں بس تھا۔ وہ سوئیٹ کے ایک حصے سے دوسرے میں چلتی آئی جو سنگ ایریا کے طور پہ استعمال ہوتا تھا۔ وہاں ایک بڑے صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے مسکراتی ہوئی جواہرات بیٹھی تھی۔ تازہ بوٹوکس کے باعث اس کی جلد مکھن کی طرح لملاؤ اور دمک رہی تھی۔ سیاہ فلر ہلنگ ٹاپ اور سیاہ اسکرٹ میں ملبوس، بھورے بال چہرے کے ایک طرف ڈالے وہ بڑی شان سے بیٹھی تھی۔

”بیٹھو میری اینجیو!“ دو انگلیوں سے اسی شان سے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میری متذبذب سی وہاں آ کر بیٹھی۔

”مسز کاردار، میں....“

”نہیں میری۔ میں بولوں گی۔ تم سنو گی۔ آج یہاں تم بولنے کے لئے نہیں لائی گئی۔“ میری نے زبان دانتوں تلے دہالی۔

”میں ماضی کو نہیں کریدوں گی، مگر تمہارے بارے میں میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ ہم دونوں جانتے ہیں کہ تم کیا کچھ جانتی تھیں؟ مگر تم نے ہاشم کے سامنے وہ باتیں نہیں دہرائیں۔ میرا نہیں خیال یہ تم نے سعدی کے گریڈ پلان میں مدد دینے کے لئے کیا ہے۔ تم نے یہ.... میرے لئے کیا ہے۔ کیونکہ تمہیں تمہاری جاب واپس چاہیے۔ میں، میری اینجیو....“ سینے پہ ایک انگلی سے دستک دی۔ مسکراتی آنکھیں اس پہ جمی تھیں۔ ”میں تمہیں تمہارا کھویا ہوا مقام واپس دلاؤں گی۔ تم قصر کاردار واپس آؤ گی، اور میرے اسٹاف کی ملکہ تم ہی ہو گی۔ تم ہمیشہ سے یہ چاہتی تھیں کہ میں تم پہ بھروسہ کروں۔ آج میں تم پہ بھروسہ کرتی ہوں۔ مجھے تمہاری وفاداری کا یقین آ گیا ہے۔ اور نگزیب تمہارے بارے میں ٹھیک کہتا تھا۔“

میری بس یک ٹک، گنگ سی اسے دیکھ گئی۔

”وہ دونوں بھاگنے کا پلان کر رہے ہیں، میں جانتی ہوں۔ تم ان کا ہر پلان مجھے بتاؤ گی۔ تم میری ان کو بھاگنے نہیں دو گی۔ صرف چند دن تک۔ پھر تم قصر کاردار واپس آ جاؤ گی۔ چاہوں تو ابھی لے جاؤں تمہیں، مگر جواہرات کاردار کا بھروسہ بھیک میں نہیں ملتا۔ اسے کمانا پڑتا ہے۔ تو تم اسے کماؤ۔ سعدی کی دوستی کو بھول جاؤ۔ اپنے حفظ ذات کے بارے میں سوچو۔ صرف اپنے بارے میں!“ اور ہاتھ کو بے نیازی سے لہرا کر اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ مسکراتی نظریں اب بھی اس پہ جمی تھیں۔ میری مرے مرے قدموں سے اٹھی اور واپس جانے کو مڑی۔

”تمہیں بتایا گیا تھا کہ یہ انڈیا ہے۔ ہے نا؟“ اس کے الفاظ پہ میری چونک کر مڑی۔

”مگر یہ سری لنکا ہے۔ دیکھ لو ہاشم کو تم پہ اعتبار نہ تھا، جانتا تھا تم سعدی کو سچ بتا دو گی۔ مگر مجھے.... اب.... تم پہ.... بھروسہ.... ہے!“

میری اینجیو بالکل لا جواب ہو گئی تھی۔ واپسی کا سفر اس نے شل دماغ کے ساتھ کیا تھا۔



حالت میری نہ مجھ سے معلوم کیجئے..... مدت ہوئی ہے مجھ سے میرا واسطہ نہیں

کلب میں مدھم بتیاں جلی تھیں۔ موسیقی بھی مدھم تھی۔ بار کاؤنٹر پہ دونوں کہنیاں رکھ کر اونچے اسٹول پہ بیٹھی شہرین، بھرے ہوئے گلاس کے منہ پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ نگاہیں بارنڈر کے عقب میں کھڑے ریک پہ جمائے وہ کسی سوچ میں گم تھی جب دوسری سمت سے نوشیرواں آتا دکھائی دیا۔ وہ اکھڑے تنے تاثرات چہرے پہ سجائے، جیک اتار کر ملازم کو دیتا، رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شہری کو دیکھ کر ابرو بچھنے۔ پھر اس کے قریب اسٹول پہ بیٹھا۔ اس کے آگے جھک کر چٹکی بجائی۔ وہ چونک کر اس جانب گھوی۔

آج اس کا لباس سیاہ تھا اور میک اپ قریباً نادر۔ آنکھوں تلے حلقے چھپانے کے باوجود دکھائی دے رہے تھے۔ شہر کو دیکھ کر تھکے

تھکے انداز میں سنہری بالوں میں انگلیاں پھیر کر ان کو پیچھے جھٹکا۔ ”تم کدھر؟“
 ”پریشان لگ رہی ہیں۔ وجہ؟“

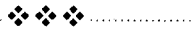
”تمہارے بھائی کے ہوتے ہوئے کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“ بوجھل آنکھوں اور تھکی آواز میں کہتی گلاس کو دو گھونٹ میں خالی کر کے وہ
 پہ پرے دھکیل دیا۔

”میری بیٹی مجھ سے لی لے، کمپنی میں مجھے شیئر نہیں دیے۔ یہ مت کہنا کہ اس بارے میں تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ میں شدید ذہنی
 کا شکار ہوں۔ اوپر سے سوئی کہہ رہی تھی، تمہاری مُمی نے اسے کہا ہے کہ ہاشم جلد دوسری شادی کرنے والا ہے۔ سب کے پاس اپنی اپنی زندگی
 ہے۔ ایک میں ہی قصرِ کاردار کے گرد بھنورے کی طرح منڈلاتی رہتی ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں سہلا لیں۔ ”اور کیا قصہ تھا
 میرا؟ صرف یہی کہ سعدی سے ذرا سی دوستی تھی میری؟ کیا میں پوچھتی ہوں ہاشم سے کہ اس کی کس کس سے دوستی ہے؟ ہونہ۔“
 مہینوں بعد.... نوشیرواں سعدی کے ذکر پر بے زار نہیں ہوا بلکہ آنکھوں میں عجیب چھین سی در آئی۔
 ”کتنّا اچھا ہوتا اگر یہ سعدی لوگ ہماری زندگیوں میں نہ آئے ہوتے شہری۔“ وہ نفرت کی آنچ لے لئے بولا تھا۔
 ”بالکل!“ اس نے گویا کراہ کر کہا تھا۔ وہ اس سے زیادہ متفق نہیں ہو سکتی تھی۔

”وہ خاندان خود کو بہت پارسا سمجھتا ہے۔ جیسے وہ اچھے اور ہم برے ہیں۔ ہر وقت وہ دونوں بہن بھائی اپنے غرور میں مجھے
 دکھانے کی کوشش کرتے تھے۔ کیا ان باتوں پہ گناہ نہیں ہوتا؟ کیا سارے گناہ امیروں کے ہوتے ہیں؟ یہ نڈل کلاس لڑکے لڑکیاں.... یہ اچھا
 اعتماد کی آڑ میں کسی کو کتنا ہرٹ کر جائیں ان کو سب معاف ہے؟“
 ”کیا ہاشم نے سعدی کو ویسے مارا جیسے اس دن مجھے مارا؟ اس کے ساتھ وہ سلوک کیا؟ نہیں نا۔ اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ میری
 ہے۔“ شہری کے غم مختلف تھے۔

”کبھی کبھی دل چاہتا ہے شہری کہ ان کی انیکسی کو آگ لگا دوں۔ سعدی سمیت ان سب کو مار دوں۔ ایک ہی دفعہ یہ سارا خاندان
 مٹ جائے۔“ وہ منتقم مزاجی سے کہہ رہا تھا۔ ”آخر ہم قاتل ہی ہیں نا تو ہم قاتل ہی اچھے۔ بس یہ لوگ ہماری جان چھوڑ دیں۔ ہم سے دور
 جائیں۔ یہ لوگ.... یہ لوگ کسی آسیب کی طرح ہیں۔ جب تک ہمارے ارگرد رہیں گے ہمیں بری خبریں ہی ملتی رہیں گی۔ میرا باپ مجھ سے
 ناراض حالت میں مرا... صرف... صرف انہی کی وجہ سے۔ میرے باپ کی موت کی وجہ بھی یہی لوگ ہیں۔“ وہ شدید کرب سے دھیرے دھیرے
 کہتا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں تیش تھی اور دل جل رہا تھا۔ شہری نے ناک سکڑ کر شانے اچکائے۔
 ”واٹ ایور۔ ان کے مرنے سے میرے مسئلے تو نہیں حل ہوں گے نا۔“ یہاں پہ شہری کو اختلاف تھا۔

شیر و نے سر جھٹکا اور بارنڈر کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ حالانکہ اب اس کا دل کسی چیز کے لئے نہیں چاہ رہا تھا۔ باپ کے ذکر نے
 ایک دم سب کچھ جلا دیا تھا۔



کولہو کے اس سرد اور خاموش تہہ خانے میں میری اینٹیو خاموشی سے کچن میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اس کی نظریں کسی غیر مرئی نقول
 پہ جمی تھیں۔ اس کے سامنے سعدی کے کمرے کا دروازہ مقفل نظر آ رہا تھا۔

دروازے کے پار.... وہ سینے پہ بازو لپیٹے کھڑا تندہی سے خاور کو دیکھ رہا تھا۔

”مجھے یہ سب سیکھ کر کیا ملے گا؟“ وہ بے زار ہوا۔ خاور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا سعدی کے مقابل آکھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ سپاٹ

اور آنکھیں سنجیدہ تھیں۔

”یہ سلیف ڈیفینس کے لئے ہے۔ تم میری لائف لائن ہو، میں تمہیں مرنے نہیں دینا چاہتا۔“ اس نے سعدی کے دونوں ہاتھ پکڑے، اور اس کو ذرا ادھر ادھر کھینچ کر درست کھڑا کیا۔

”خاموشی کو سننے کی عادت ڈالو۔ خاموشی کو دیکھو۔ محسوس کرو۔ میرے ہاتھوں کو دیکھو۔ میرے پیروں کو دیکھو۔“ وہ آہستہ آہستہ ہاتھ گھماتے ہوئے کہہ رہا تھا، اور سعدی الرٹ سا اس کو دیکھ رہا تھا۔

”اس کو روکو!“ اس نے ایک دم اپنا ہاتھ تلوار کی طرح سعدی کے بازو پہ مارنا چاہا تو سعدی نے تیزی سے اپنی کلائی جوانی تلوار کی طرح اسکی کلائی سے ٹکرائی۔

”ہاتھ کو درست رکھو۔ ایسے۔“ وہ اب اس کو کلائی سے پکڑے بولتے ہوئے سکھار رہا تھا۔

دفعۃً سعدی نے اس کے کندھے سے اوپر دیوار پہ کچھ دیکھا۔ ”کیا یہ نشان تم نے لگایا ہے؟“

”کیسا نشان؟“ خاور نے چہرہ اموز کر دیکھا۔ وہاں کوئی نشان نہیں تھا۔ اس نے چہرہ جیسے ہی واپس پھیرا، سعدی کا زوردار مکا اس

کے منہ پہ پڑا۔ لمبے بھر کو اس کا دماغ گھوم گیا۔

سعدی نے مٹھی کو چہرے کے قریب لے جا کر اس میں پھونک ماری۔ ”واؤ۔ اب میں بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ چلو ٹریننگ جاری

رکھتے ہیں۔“

خلاف توقع خاور برامانے بغیر سر جھٹک کر واپس سامنے آکھڑا ہوا۔

باہر بیٹھی میری بنوز کسی گہری اندھی سوچ میں گم تھی۔

ان سے دور..... سرما کی اس سردرات میں جیل کا وہ تاریک بیرک خاموش پڑا تھا۔ فارس مسلسل دائیں سے بائیں ہلکتا شدید

اضطراب کی حالت میں لگتا تھا۔ آتش دیوار سے لگا آکڑوں بیٹھا، منہ میں کچھ چباتا اسے صبر سے دیکھتا رہا۔

”ایک نصیحت کی تھی تمہیں۔ دشمن پہ ترس نہ کھانا۔ تم نے وہی کیا۔ اگر نہ کیا ہوتا تو آج جیل میں نہ ہوتے۔“ اس کا اشارہ اے ایس

پی کی طرف تھا۔

”اس پہ نہیں، اس کے بچے پہ ترس آیا تھا مجھے۔ اور زیادہ دماغ نہ خراب کرو میرا۔“ سلاخوں تک رکا، دونوں ہاتھوں سے ان کو پکڑ کر

زور سے جھٹکا دیا۔ چہرے پہ بے بسی اور آنکھوں میں غصہ تھا۔

”ایسے نہیں ٹوٹیں گی یہ۔ جب تم پہلی دفعہ جیل میں آئے تھے تب بھی ایسے ہی کیا کرتے تھے۔ بڑے عرصے بعد پرانا غازی نظر

آیا ہے۔“

”پریشان ہوں میں!“ وہ وہاں کھڑا بے بسی بھری برہمی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ پیچھے زمین پہ بیٹھا آتش مسکرایا۔

”تم پریشان نہیں ہو۔ تم خوفزدہ ہو۔“

”ہاں میں خوفزدہ ہوں۔ وہ میری بہن کا بیٹا ہے۔ وہ بچہ ہے۔ کم عمر ہے۔ وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پہلی دفعہ لگا ہے کہ وہ اسے مار

دیں گے۔“ پھر وہ تہیہ کر کے اسکی طرف گھوما۔ ”مجھے یہاں سے نکالو۔ اپنے آدمیوں سے کہو مجھے باہر لے جائیں۔ میں اسے وہاں سے نکال

لاؤں گا۔“

”چچ چچ۔“ آتش نے افسوس سے سرکوفی میں ہلایا۔ ”بہت عرصے بعد پرانا غازی نظر آیا ہے۔ کیا سکھایا تھا تمہیں جیل میں چار سال

وہ تمہارے ہاتھ قید کر سکتے ہیں تمہارا دماغ نہیں۔ باہر نکل کر کیا کرو گے؟ خاندان کے ایک لڑکے کو بچانے جاؤ گے اور باقی عورتوں کو پیچھے

چھوڑ جاؤ گے؟ پولیس کیا کرے گی تمہارے گھر والوں کے ساتھ ہم دونوں کو علم ہے۔ غازی..... ہاتھوں سے مت سوچو! دماغ سے سوچو!“

فارس بائیں ہاتھ سے کپٹی مسلتا سر جھکائے کھڑا رہا۔ کتنی ہی دیر۔

”کہتے ہو تو تمہیں باہر نکال دیتا ہوں، لیکن یہ قلعندی نہیں ہوگی۔ دماغ سے سوچو، تم اس وقت اس کے لیے کیا کر سکتے ہو؟“

فارس سلاخوں سے ماتھائی، آنکھیں موندے کھڑا رہا۔ کھڑا رہا۔ پھر اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ اس نے چہرہ اٹھایا۔ سنہری آنکھوں میں سوچ تھی۔ ٹھنڈی گہری سوچ۔

”شوکت کہاں ہوتا ہے آج کل؟“ اس نے بدلی ہوئی، ٹھہری ہوئی آواز میں آتش سے اس کے ایک پرانے ساتھی کا پوچھا۔

”جہاں بھی ہے، تمہارا کام کل ہی کر دے گا۔ بول کیا کام ہے؟“ وہ دل سے خوش ہوا تھا۔ اسے پرانا غازی نہیں پسند تھا۔ اسے یہ والا غازی پسند تھا۔



کسے خبر کہ تہہ خاک آگ زندہ ہو ذرا سی دیر ٹھہر اور دیکھ بھال مجھے

سرما کے دھندلکوں میں انکیسی ڈوبی کھڑی تھی۔ حنین خوابیدہ چہرے کے ساتھ کچن کی گول میز پر بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ وہ اب بھی فجر کے لئے نہیں اٹھتی تھی۔ الارم بھی نہیں لگاتی تھی۔ الارم کے باوجود ناشی تو؟ ڈر لگتا تھا۔ مگر باقی کی چار نمازیں پڑھنے لگی تھی۔ ٹیچر نے کہا تھا کہ جس وقت بھی اٹھو فجر پڑھ لو۔ وہ ساڑھے سات بجے فجر پڑھ لیتی تھی۔ قضا اور روشن۔ مگر گلت کم تھا۔ ناشتہ کرتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر ادھر ادھر ایک سرسری نظر دوڑائی۔ زمر سیاہ کوٹ میں ایک فائل پڑھتی چائے پی رہی تھی۔ بالکل منہمک سی۔ اسامہ اسکول یونیفارم میں ناشتہ جلدی جلدی کر رہا تھا۔ ندرت بھی تیزی سے کام میٹتی، ریسٹورانٹ جانے کی تیاری میں تھیں۔

ایک میں ہی ہوں، نکمی اور نا کام! اس کا ڈپریشن بڑھنے لگا۔ ست روی سے لقمے زہر مار کرنے لگی۔ تبھی بیل ہوئی۔ ندرت باہر کو پکیں۔ حنین کو صداقت کی آواز سنائی دی تھی۔ (اسے گاؤں سے آج صبح واپس آنا تھا) وہ سر جھکائے کھاتی رہی۔ تبھی اسامہ اس کے قریب کھکا۔

”بھابھی آ نہیں رہی۔ بھابھی آگئی ہے۔“ حنہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ دوسرا سننے، داخلی دروازے پر ندرت مسکرا کر صداقت اور اس کے ساتھ ایک لڑکی کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ صداقت کی عمر کی (یعنی حنین سے چھوٹی) سانولی، دہلی پتلی بالوں کی کس کر چوٹی کیے، مگر تھوڑا سا سنہری زیور پہنے وہ گاؤں کی مزارعن جیسی لگتی تھی، مگر صاف ستھری اور اچھی تھی۔

”حنہ.... صداقت کی بیوی کا نام کیا ہوگا؟ امانت؟“ سیم پھر اس کے کان میں گھسا۔

”اور ان کے بچوں کا خیانت۔ خباثت!“ دونوں بہن بھائی ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنسے۔ زمر نے نگاہ اٹھا کر ان کو دیکھا تو ان کی مسکراہٹ فوراً سٹ گئی۔

اس کا نام امانت نہیں تھا، حسینہ تھا۔ سیم نے تو خیر بمشکل ہنسی کا گلا گھونٹا مگر حنین کھانسی کے بہانے تھوڑا بہت ہنس گئی۔ خیر، سب نے اٹھ کر حسینہ بی بی کو خوش آمدید کہا۔ ندرت نے جانے سے پہلے اسے کچن دکھایا، کام سمجھایا (اب آگئی ہے تو کیا خرے اٹھانے۔ پہلے دن سے کام پہ لگے گی تو آگے عادت ہوگی۔) اور پھر یکے بعد دیگرے سب گھر سے رخصت ہو گئے۔ صداقت نیچے بڑے بابا کے کمرے میں چلا گیا اور حنین سائیں سائیں کرتے خاموش گھر میں ادھر ادھر نہلتی، بالآخر اوپر اپنے کمرے میں آگئی۔ ایک ست نظر درود یوار پہ ڈالی۔ یہ کمرہ اتنا کھرا بکھرا کیوں لگتا تھا؟ جیسے چیزوں کا رش لگا ہے۔ مگر کہاں سے صفائی شروع کرے اور کون کرے؟

کچھ دیر بور ہوتی رہی پھر نیچے آئی تو حسینہ دوپٹہ کسے، کچن صاف کر رہی تھی۔ لمحے بھر کو حنہ سیڑھیوں کے اختتام پہ ٹھہری گئی۔ کچن کاؤنٹر ابھی صاف نہیں کیا تھا اس نے، میلے برتن اکٹھے کر کے سنک میں رکھے تھے، اور فرش کا جھاڑو لگایا تھا۔ مگر کچن.... وہ کچن جس کو وہ اس ایک

ہفتے میں رگڑ رگڑ کر تھک گئی۔ وہ کچن یکدم چپکنے لگا تھا۔ صاف ستھرا۔ نکھر نکھرا۔

وہ ابھی ہوئی سی اوپن کچن کے دہانے پر آرکی۔

”یہ تم نے.... کیسے صاف کیا؟“ تذبذب سے بولی تھی۔ ڈسٹ بن کا نیا شاپر لگاتی حسینہ مڑی اور مسکرا کر اسے دیکھا۔

”باجی! اللہ جنم رسید کرے میری پچھسی کو بڑی ہی کوئی فتنہ عورت تھی، وہ....“

”اے.... ایسے نہیں کہتے فوت ہوؤں کو۔“ وہ ڈپٹ کر بولی۔

”جی باجی مگر وہ پوری فوت نہیں ہوئی۔ بدروح اب بھی پورے گاؤں میں منڈلاتی ہے، مگر ایک بات وہ ہمیشہ کہتی تھی کہ

شانو.... شانو مجھے پیار سے بلاتے ہیں.... وہ کہتی تھی شانو! جب تک کسی کمرے کے چاروں کونوں سے رگڑ رگڑ کر گند یا چیزیں نہ نکالی جائیں،

تب تک کمرے کی لاکھ صفائی کرلو، صفائی نہیں لگے گی۔ فرش کے کونے صاف کیے میں نے اور اس شیلیف (کاؤنٹر ٹاپ کے لیے پنڈ میں

بولے جانے والا لفظ) کے کونوں میں رکھی ساری چیزیں اٹھالیں۔ باجی! جب کونے خالی ہو جائیں تو صفائی ہوتی ہے۔ کونوں کو ہمیشہ خالی رکھنا

چاہیے۔ اب دیکھیں نا باجی! ہیں ہم گاؤں کے لوگ، مگر یہ باتیں صرف ہم ہی لوگ جانتے ہیں، ورنہ آج کل کے موئے کمپیوٹر تو یہ باتیں نہیں

سکھا سکتے۔“ ایک سوال کیا پوچھا، تازہ تازہ اسلام آباد آئی میارن کو اپنا احساس کمتری چھپانے اور رعب ڈالنے کا موقع مل گیا۔ عام حالات

میں حنین بہت کچھ کہتی (مثلاً) یہ صداقت گاؤں میں جا کر سب کو بتاتا ہے کہ مالکن کی بیٹی سارا وقت کمپیوٹر پہ بیٹھی رہتی ہے؟) مگر.... اس حسینہ

نے ایسی بات کہہ دی تھی جو حق کے دل کو ایک دم جھنجھوڑ کر رکھ گئی تھی۔

”غلط! بالکل غلط!“ وہ کسی خواب کی سی کیفیت میں بولی تھی۔ ”تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ کمپیوٹر انسان کو کیا کچھ سکھا سکتے ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے وہ فوراً واپس اوپر کو بھاگی پھر رکی۔

”سنو زیادہ باتیں نہ بنایا کرو۔ ہمارے گھر میں زیادہ بولنے والوں کو پسند نہیں کیا جاتا۔ اور دھیان سے کام کرو۔“ رعب سے ڈپٹ

کر تیز میٹر دھیاں چڑھتی گئی۔ (حسینہ بڑبڑاتے ہوئے جھاڑ دینے لگی۔)

اپنے اور ندرت کے کمرے میں آ کر حنہ فرش پہ بیٹھی اور بیڈ پہ لیپ ٹاپ رکھ لیا۔ گوگل صاحب اپنا خالی چوکھٹا لے مسکرا کر اس کو

دیکھ رہے تھے۔

صداقت کی شادی کے دنوں میں جب اسے گھر صاف کرتے وقت اپنی غلطیاں سمجھ نہیں آتی تھیں تو سوچا امی سے پوچھے (مگر امی

ڈانٹیں گی کہ جب پہلے کہتی تھی، تب کیوں نہیں سنا؟) کبھی سوچا بڑے ابا کو فون کرے (اونہوں۔ پھر تو ان کی اخلاقی فتح ہو جائے گی کہ پوتی نکمی

ہے۔) کبھی خیال آیا.... زمر (مگر یہاں انا آڑے آ گئی۔) سیم سے پوچھنا اپنی بے عزتی کروانے کے مترادف تھا۔ صرف سعدی تھا جو سب کی

سنتا، سب کی مدد کرتا تھا مگر سعدی نہیں تھا۔

لیکن گوگل بھی تو تھا۔ اس کا پرانا دوست۔

اس نے پوچھا (کی بورڈ پلانگیاں چلاتے ہوئے) کیسے رکھا جائے اپنے کمرے کو صاف اور آرگنائزڈ؟

لحے بھر میں جوابات نگاہوں کے سامنے چپکنے لگے تھے، اور یہ پہلی دفعہ تھا جب حمین ذوالفقار یوسف خان نے وہ دنیا دریافت کی تھی

جو گھر سے باہر نہیں تھی، بلکہ وہ جو گھر کے اندر تھی۔

”صاف لڑکی وہ ہوتی ہے جو گندالماریوں میں نہ پھینکے، بلکہ ڈسٹ بن میں پھینکے۔“ گوگل اسے سمجھا رہا تھا۔ ”اپنی الماریوں سے

شروع کرو۔ سارا سامان.... اور سارے سے مراد ہے.... سارے کا سارا سامان باہر نکالو۔ تین ڈبے بناؤ۔ ایک ردی کا۔ ایک خیرات کا۔ اور

ایک وہ جو تمہارا ہے۔“ وہ شاید گھنٹہ بھر بالکل سن سی، یک ٹک پڑھتی رہی، پھر اس نے آستین اوپر چڑھائے، دوپٹہ کسا، بال باندھے۔ ایک عزم

سے اپنے کمرے کو دیکھا۔ آنکھوں میں چمک لئے وہ اونچا سا بولی تھی۔

”میں اس ملک کی سب سے آرگنائزڈ لڑکی بننے جا رہی ہوں۔“ (شکر ہے سیم نہیں تھا، ورنہ اتنا ہنستا کہ بس!)

حنین ہمیشہ سمجھتی تھی کہ گھڑ لڑکیاں وہ ہوتی ہیں جو چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی سنبھال کر رکھتی ہیں۔ غلط۔ وہ کنجوس اور گندی لڑکیاں ہوتی ہیں، کیونکہ سنبھالنے کے لئے رکھی چیزوں میں سے اکثر ”گند“ ہوتی ہیں۔

اس نے الماریاں خالی کیں۔ دراز لائے۔ شیفٹ کا سامان بھی فرش پہ ڈھیر کیا۔ چیزیں، چیزیں، چیزیں۔ ہم بذاتِ خود کتنی گندی میلی قوم ہیں۔ رومی سے الماریوں کو بھر کر رکھتے ہیں۔ مگر اب مزید نہیں۔

گوگل نے کہا تھا، ہر وہ چیز جو تم نے پچھلے دو سال سے استعمال نہیں کی، وہ پھینکو۔ قابلِ استعمال چیز خیرات کر دو اور صرف ضرورت کی چیز واپس رکھو۔ اس نے بھی تین ڈھیر لگانے شروع کیے۔ میک اپ کا ایکسپائرڈ پرائیوٹ سامان، پرانی چوڑیاں، پرانے کپڑے، کاغذ، کاپیاں، کتابیں، جوتے، سوکھے ہوئے قلم، خالی ڈبے۔ اف اتنا گند۔ جب اس کے تینوں ڈھیر مکمل ہوئے اور وہ اٹھی تو کمر دکھ رہی تھی، مگر حسینہ کو آواز نہ دی (انا!) خود ہی کوڑے والے بڑے سیاہ شاپروں میں سب ڈالا اور باہر رکھ آئی۔ کچن سے اخباریں اٹھائیں اور اپنی الماریوں میں بچھائیں۔ شیفٹ صاف کیے۔ چیزیں درست کر کے، جوڑے رکھیں۔ دراز صاف اور ہلکے ہو گئے۔ جب ساری الماریاں اور دراز اندر سے صاف ہو چکے تو وہ جالوں والا ڈنڈا لائی، ہر کونے سے جالے صاف کیے۔ گوگل کہتا تھا، پھول جھاڑو سے دیواروں پہ بھی جھاڑو لگاؤ۔ جو حکم۔ وہ بھی کیا۔ پھر گیلی اخبار سے شیشہ صاف کیا۔ گیلے کپڑے سے ڈسنگ کی۔ جھاڑو لگایا۔ صوفے اور پلنگ، ڈھکیل، ڈھکیل کر، اور بالخصوص کونوں سے جھاڑو لگایا۔ رگ کو دیکھ کر کہہ دیا۔ فرش پہ موپ لگایا۔ (موپ دھونے کی ہمت نہیں تھی، وہ ایسے ہی کچن میں حسینہ کو دے آئی)۔ اب (نوٹی کمرے ساتھ) واپس آ کر کمرہ دیکھا تو طمانیت کا احساس ہوا۔ مگر ہاں، بیڈ شیٹ رہ گئی۔ جلدی سے اسے تبدیل کیا۔ اُف سب اتنا نکھر گیا تھا۔ صاف چمکتا ہوا۔ گردن اٹھائی تو دل دھک سے رہ گیا۔ پتکھے پہ جالے تھے۔

اوہ نو۔ وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کر کرا رہی تھی۔ اب اگر اوپر جالوں والا جھاڑو مارا تو سارے کمرے کی صفائی کا بیڑہ غرق ہو جاتا تھا۔ کیا کرے؟ دوڑ کر گوگل سے پوچھا۔ جواب پا کر سکھ کا سانس لیا۔ کمرے کے وسط میں میز کھینچ کر رکھی، اوپر اسٹول رکھا، اور پرانا تکیہ کا کور لئے اوپر چڑھی۔

ایک ایک پہ باری باری کور چڑھایا، اور رگڑ کر جالے اس کے اندر اتار لئے۔ پتکھا گزارے لائق صاف ہو گیا۔ جالے نیچے بھی نہیں گرے۔

اب جب نیچے کھڑے ہوئے حنین نے گردن گھما گھما کر اپنے کمرے کو دیکھا تو دل میں سکون سا بھر گیا۔ ایک تشفی کا احساس تھا کہ یہ کمرہ اندر تک الماری کے دروازوں اور نہاں خانوں تک صاف ستھرا ہے۔ صفائی کا احساس.... طمانیت.... انمول ہوتی ہے۔

اس سارے میں اس کی حالت شدید درگوں ہو چکی تھی مگر وہ خوش تھی۔ بے حد خوش۔ صاف استری شدہ کپڑے نکالے۔ نہادھو کر بال برش کر کے، پرفیوم لگا کے نماز پڑھی، نیچے جا کر کھانا کھایا اور پھر کمرے میں آ کر کمبل تان کر سو گئی۔ بڑی کوئی میٹھی نیند تھی جو اس وقت اسے آئی تھی۔

حنین کی آنکھ باتوں کی آواز سے کھلی تھی۔ بمشکل اس نے آنکھیں کھولیں اور کمبل ہٹا کر دیکھا۔ مغرب ہو چکی تھی اور کمرے کی بتیاں جلی تھیں۔ وہاں اسامہ اور ندرت کھڑے زمر سے بات کر رہے تھے جو کوٹ اور پرس اٹھائے چوکھٹ میں کھڑی ستاشی انداز میں کہہ رہی تھی۔

”واقعی بھی، اس نے آج بہت کام کیا ہے۔ آپ کا کمرہ تو چمک رہا ہے۔“ حنین نے پلکیں جھپکیں۔ کہنی کے بل اٹھی۔ (کمرہ بھی تیک اگڑی ہوئی تھی۔)

”پنکھا، لائٹس ہر شے صاف کی ہے۔ الماریاں تک جوڑی ہیں۔“ ندرت کی آواز میں ستائش تھی۔ حنہ خوابیدہ آنکھوں اور لبوں پہ موصوم مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ ادھر اسامہ کہہ رہا تھا۔

”واہ امی۔ یہ صداقت بھائی کی بیوی تو بہت اچھا کام کرتی ہے۔“

حنین کا منہ کھل گیا۔ وہ یکدم بالکل شل ہو گئی۔ زمر نے اسے اٹھتے دیکھ لیا تھا۔ تبھی پکارا۔ ”حنین تم نے اپنی نگرانی میں اس سے صفائی کروائی تھی نا؟ ویسے صداقت سے کہیں زیادہ سلیقہ شعار ہے یہ لڑکی۔ آئی ایم امپریسڈ!“

حنین کے اوپر سے گویا ٹرک گزر گیا تھا۔ وہ سب اب بار بار حنین کی تعریف کر رہے تھے۔ ڈھیروں آنسو حنہ کے حلق میں جمع ہوئے۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ ایک دم سے رخ موڑ کر مکمل تان کر واپس لیٹ گئی۔

اگر اس وقت وہ دفاع میں ایک لفظ بھی کہتی تو اسے پتہ تھا وہ رونے لگ جاتی۔ سو مکمل کے اندر خود کو چھپا لیا۔



کہاں سے لائیں بھلا ہم جواز ہم سفری تجھے عزیز ترے خواب اپنا حال مجھے

اس چمکیلی مگر ٹھنڈی دو پہر آبدار عبید اپنی رہائشگاہ کے گیٹ سے کار نکال رہی تھی جب ٹھٹک کر رکی۔ ایک شخص وہاں منتظر سا کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک ڈبہ پکڑ رکھا تھا جسے لہراتے ہوئے وہ کار تک آیا۔ آبی رکی، مگر شیشہ نہیں کھولا۔ اس نے قریب آ کر ڈبہ دکھایا۔ اوپر فارس غازی کا نام لکھا تھا۔ آبدار نے تیزی سے بیلٹ کھولی اور باہر نکلی۔ گیٹ پہ مامور گارڈز اس طرف آنے لگے مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر ان کو پلٹ جانے کا اشارہ کیا اور خود اس شخص کی طرف مڑی۔

”یہ فارس غازی نے آپ کے لئے بھیجا ہے۔“ اس نے ڈبہ بڑھایا۔ آبی نے نیکی نظروں سے اسے دیکھتے ڈبہ تھاما۔ وہ فوراً پلٹ کر اپنے موٹر سائیکل کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ وہاں سے دور ایک ہاسپٹل کے پارکنگ ایریا میں کار روکے اندر بیٹھی تھی۔ اور ڈبہ کھلا پڑا تھا۔ اندر ایک لکڑی کا چھوٹا سا بین کیس تھا، اور اوپر ایک چٹ رکھی تھی جس پہ ایک نمبر درج تھا۔ وہ سوچتی رہی۔ بالآخر اس نے موبائل نکالا اور وہ نمبر ڈائل کیا۔

پہلی گھنٹی پہ کال مل گئی تھی۔ بھاری مگر دھیمی مردانہ آواز سنائی دی تھی۔

”میرا پارسل مل گیا؟“ آبدار کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

”کیا آپ کی جیل میں پانچ کلومیٹر تک موبائل جیمز نہیں لگے ہوتے؟“

”ہمیں جیمز کو دھوکہ دینے کے سوا طریقے آتے ہیں۔ کیسی ہیں آپ؟“

”کنفیوزڈ ہوں۔ اس بین کا کیا کروں؟“ اس نے لکڑی کا کیس کھولا۔ اندر پلاسٹک میں لپٹا سنہری قلم رکھا تھا۔ وہ بال بین تھا جس کو پیچھے سے دبائے پن ب باہر نکلتی تھی۔

”اسے مت چھوئیں۔“ وہ جلدی سے بولا تھا۔ ”اس میں سائنائڈ ہے۔ زہر۔“

آبدار نے جلدی سے کیس بند کیا۔ خوبصورت پیشانی پہ لکیریں ابھریں۔ ”میں اس کا کیا کروں؟“

”یہ اسے دینا ہے۔“ وہ دھیمسا بولا۔

”وہ اس کا کیا کرے گا؟“

”دفاع از خودیشتن!“ (دفاع ذات!)

”آپ تو فارسی بھی بولتے ہیں۔“ مگر پھر وہ برہم ہوئی۔ ”میں اپنے باپ کو دھوکہ دوں ہاشم سے دغا کروں، بین الاقوامی قوانین توڑ

وں اور سکیورٹی کو بائی پاس کر کے یہ قلم اس تک پہنچاؤں یہ کرنے کا حکم دے رہے ہیں آپ مجھے؟“

”میں صرف درخواست کر رہا ہوں۔“ وہ نرمی سے بولا تھا۔ اپنی پیرک میں دیوار سے لگا کھڑا وہ آستین موڑے فون کان سے لگائے کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ وہ برہمی وہ غصہ وہ بے بسی سب مفقود تھا۔ وہ بالکل پرسکون تھا۔

آبدار کے تنے نقوش پھر سے ڈھیلے پڑے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسکرا دی۔

”اور میں یہ کیوں کروں گی؟“

”بدلے میں، میں بھی آپ کے لئے کچھ کروں گا۔“

”مثلاً کیا؟“ وہ شرارت سے نچلا لب دبا کر بولی۔

”جو آپ کہیں۔“ وہ بھی مسکرایا تھا۔

”آپ میرے ساتھ چائے پیئیں گے؟“ کہہ کر اس نے بے اختیار دانتوں تلے زبان دبائی اور خفت سے آنکھیں میچیں۔ پیرک میں کھڑے فارس کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔

”چائے؟“

”دو دفعہ انکار کیا آپ نے چائے کے لئے۔ ایک تب جب آپ پہلی دفعہ ادھر آئے اور ایک تب جب ہم ایس ایچ او صاحب کے کمرے میں ملے تھے۔“

وہ ہلکا سا ہنس۔ سر جھکائے نفی میں گردن جھٹکی اور جوتے سے زمین کو مسلتے بولا۔ ”میں شادی شدہ آدمی ہوں، آبدار بی بی!“

”پھر تو آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ ترنت بولی۔

”اوکے... میں آپ کے ساتھ چائے پیوں گا، اگر میں باہر آیا تو۔ مگر آپ یہ اس کو دے دیں گی۔“ فارس نے نرمی سے یاد کرایا۔

”لیکن جب میں اس سے مل لوں گی تو فصیح کو دیا وقت ختم ہو جائے گا اور وہ اس کو مار دے گا۔“

”جو میں کہہ رہا ہوں آپ وہی کریں۔“ اس کی آواز سنجیدہ اور بے پلک تھی۔ آبی نے مسکرا کر شانے اچکائے۔

”آپ کو اچھا لگتا ہے یہ کرنا؟“

”کیا کرنا؟“

”جیل میں بیٹھ کر، خود مقید ہو کر بھی، ہم سب کو کنٹرول کرنا۔“

”میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ شرافت سے قید کے دن کاٹ رہا ہوں۔“ وہ سادگی سے بولا۔ لبوں پہ مسکراہٹ پھر سے درآئی تھی۔

آبی مسکرا دی۔ ”میں اس جیل صرف اس لئے گئی تھی کیونکہ میں وہ جگہ دیکھنا چاہتی تھی۔ دوبارہ کبھی میں ادھر نہیں جانا چاہتی تھی“

مگر.... (ٹھنڈی سانس بھری) آپ کے لئے میں یہ کر لوں گی۔ ”وہ فون بند کرنے لگی جب اس نے پکارا۔“ ”آبدار۔“ وہ ٹھہری۔

”تھینک یو!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔ آبدار عبید کو نہیں معلوم وہ کیوں مسکرا رہی تھی مگر وہ مسکرا رہی تھی۔ ایک دم سے

ساری دنیا خوبصورت لگنے لگی تھی۔



شہر آباد کر کے شہر کے لوگ..... اپنے اندر بکھرتے جاتے ہیں

دو پہر کی نرم سنہری کرنیں قصر کاردار کی اونچی کھڑکیوں سے چھن چھن کر اندر گر رہی تھیں۔ لاؤنچ میں کنارے پہ کھڑکی کے آگے

شاہانہ کرسی پہ بیٹھی جواہرات کروفر سے ناک سے کبھی اڑا کر بولی تھی۔ ”اور بھی کچھ کہہ رہے تھے تم۔“

”آپ کا اس ہفتے ایک Photo Op کرنا ہے۔ زلزلہ متاثرین کے ساتھ۔“ وہ ساتھ والی کرسی پہ بیٹھا اپنے سیل فون پہ کچھ چیک کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”احمر۔ کیا یہ بہت مصنوعی نہیں لگے گا؟“

”مسز کاردار۔ سب کو معلوم ہے کہ Photo Ops جھوٹ اور بکواس ہوتے ہیں، لیکن اس جھوٹ کو پیش کرنے کے لئے مہارت ہونی چاہیے۔ جو جتنا اچھا جھوٹ بولتا ہے، اس کا فوٹو اوپ اتنا ہٹ جاتا ہے۔ اسی لئے آپ نے مجھے ہائر کیا ہے نا۔ سو مجھے اپنا کام کرنے دیں۔“ وہ جھل سے کہہ رہا تھا۔ جواہرات نے جواباً ہاتھ بڑھا کر اس کا شانہ تھپکا۔ ”جو تم کہو!“

لاؤنج کے ان ڈور پلانٹ کو پانی دیتی فینو نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر وہ منظر دیکھا اور پھر ناخوشی سے ناک سکڑتی واپس کام کرنے لگی۔ وہ جواہرات کا اب صرف پی آر آفیس نہیں تھا۔ نہ ہی وہ صرف اس کا منیج کنسلٹنٹ رہا تھا۔ وہ اس کا ”باڈی مین“ بننا جا رہا تھا۔ باہر لان میں کارر کی، دروازے کھلے اور ہاشم کا ردار کوٹ کا بٹن بند کرتا باہر آتا دکھائی دیا۔ وہ آنکھیں سامنے اونچے قصر پہ جمائے چہرے پہ خنکی اور برہمی طاری کیے ساتھ نکلے رئیس سے بات کر رہا تھا۔

”یہ میں جانتا ہوں کہ وہ بیٹے کی ضمانت کے لئے واقعی کورٹ گیا تھا۔ مزید کیا معلوم ہو سکا ہے۔“

”سرفاطی نے پچھلے تین ماہ میں چار دفعہ ہمارے جاننے والے ایک کورئیر کے ذریعے کرنسی باہر لائڈر کروائی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے اثاثے باہر منتقل کر رہا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے نام پہ ایک گھر بھی بارسلونا میں قسطوں میں خرید رہا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ پتھریلے تاثرات کے ساتھ سنتا، برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ رئیس اس سے ایک قدم پیچھے تھا۔

”کیا اس سے بات کریں گے آپ؟“

”تمہاری جگہ خاور ہوتا تو یہ کبھی نہ پوچھتا۔“ وہ کہہ کر لمحے کورکا، پھر سر جھٹک کر اوپر چڑھتا گیا۔ ”ابھی اس پہ نظر رکھو۔ صرف نظر۔“ وہ اندر آیا اور بس ایک سرسری نظر ماں اور اس کے باڈی مین پہ ڈال کر اوپر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب فریش ہو کر شرٹ اور ٹراؤزرز میں ملبوس آرام دہ حلیے میں نیچے آیا تو جواہرات تنہا بیٹھی تھی۔ وہ احمر کی چھوڑی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائی۔

”آپ نے کال کی تھی۔ کوئی اہم بات تھی؟“

”ہوں۔“ جواہرات نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ خاور والے سارے مسئلے کے بہت دن بعد وہ بالآخر ذہنی طور پہ پرسکون ہوتا نظر آ رہا تھا۔ جواہرات نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھپکا۔

”ہاشم..... شہری اور تمہاری ڈائیوئرس کو دو سال ہونے کو آئے ہیں۔ سعدی، خاور، وہ سارے مسئلے بھی حل ہو گئے ہیں۔ فارس بھی قصہ پارینہ ہو گیا۔ اب آگے بڑھنے کا وقت ہے۔ نئی زندگی شروع کرنے کا وقت ہے۔“

”آپ چاہتی ہیں کہ میں شادی کر لوں۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔

”بالکل۔ اور اب تمہیں جلد فیصلہ کرنا ہوگا۔ مجھ سے مسز شائستہ ذکی نے کہا ہے کہ ان کے بیٹے کے لئے ہارون کو پیغام بھجواؤں۔ اگر ہارون، آبی کے لئے انٹرنیٹڈ ہوا تو مسز شائستہ ذکی باقاعدہ پرپوزل دیں گی۔ لیکن اگر تم آبی میں دلچسپی رکھتے ہو تو کوئی فیصلہ کرلو۔“ وہ کہنے کے ساتھ نرمی سے اس کے ہاتھ کو تھپک بھی رہی تھی۔

ہاشم نے گہری سانس لے کر تنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔ وہ بولا کچھ نہیں، مگر چہرے پہ سب لکھا تھا۔

”میں دیکھ سکتی ہوں کہ آبی کے لئے کسی اور کارپورپوزل آتا دیکھ کر تم ڈسٹرب ہوئے ہو، اس لئے..... فیصلہ کرلو۔“ ہاشم نے نظر اٹھا کر جواہرات کو دیکھا اور ذرا سا مسکرایا۔

”وائقی.... اب آگے بڑھنے کا وقت ہے۔“

بیڑھیوں کے اوپر.... کمرے کے آگے بنی رینگ پہ کھڑے نوشیرواں کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ آبدار؟ وہی آبدار؟ وہ شدید ناخوش نظر آنے لگا تھا۔



تمام خانہ بدوشوں میں مشترک ہے یہ بات سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ کے دیکھتے ہیں اس روز سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔ کمرہ عدالت میں بیٹر چل رہا تھا۔ زمر سرخ پڑتی ناک کے ساتھ اپنی میز پہ بیٹھی، گواہ کے بیان کو سختی کا غلہ پہ کچھ لکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بخار کی حدت سے گلابی پڑ رہا تھا۔ آنکھوں تلے حلقے تھے۔ فارس گا ہے بگا ہے نظر اٹھا کر اس کو دیکھتا تھا۔ وہ گو کہ پہلے کی طرح پرسکون تھا مگر اس کو دیکھتے ہوئے آنکھوں میں فکر مندی در آتی تھی۔ ذرا سا اس کی طرف جھک کر بولا۔

”طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو سماعت میں نہ آتیں۔ اگلی تاریخ کا انتظار کر لیتیں۔“

زمر نے ملا متی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تمہاری روز روز شکل دیکھنے کا۔ مگر جو تمہارے گھر والے ہیں نا، وہ بہت پریشان ہیں۔ چاہتے ہیں تم جلد رہا ہو جاؤ۔ تمہاری تو عادت ہے جیل جانا۔ تمہیں فرق نہیں پڑتا لیکن ان کو پڑتا ہے۔“

فارس نے سکون سے اس کی بات سنی۔ ”وہ میری گرل فرینڈ نہیں تھی۔“

”جیسے مجھے بہت فرق پڑتا ہے۔“ سر جھٹک کر وہ کٹہرے کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ مسکراہٹ دبائے خاموش ہو گیا۔

کٹہرے میں اب کی بار ایک درمیانی عمر کی عورت کھڑی تھی۔ سانولا مگر سنجیدہ چہرہ، نفیس لباس، اور اٹھی ہوئی گردن۔ اس کے سامنے کھڑا پراسیکیوٹر سوال کر رہا تھا۔

”مقتول.... یعنی آپ کے شوہر.... قمر الدین صاحب.... فارس غازی کا ذکر آپ سے کرتے تھے؟“

”جی۔“

”آب جیکشن یور آنر۔ heresay۔ (سنی سنائی بات)“ زمر نے بے زاری سے آواز بلند کی، ساتھ ہی زکام زدہ سانس ناک سکڑ کر اندر کھینچی۔

”یور آنر‘ مقتول کی بات کی اہمیت سے دفاع کیسے انکار کر سکتا ہے۔“

”اور رولڈ!“ جج نے پراسیکیوٹر کی پوری توجہ سننے کی زحمت بھی نہ کی اور ناگوار سے زمر کا اعتراض رد کیا۔ وہ شدید کینہ پرور نظروں سے ان کو دیکھتی رہی۔ فارس بار بار ایک خاموش نظر اس پہ ڈالتا تھا۔

”جی وہ اکثر فارس غازی کا ذکر کرتے تھے۔“ اب وہ فارس اور اس کی دشمنی کے متعلق کورٹ کو آگاہ کر رہی تھی۔ زمر سر جھٹکائے کچھ لکھتے ہوئے سختی رہی۔ اپنی باری آنے پہ وہ اٹھی اور اتنے ہی برے موڈ کے ساتھ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”مسز قمر الدین.... مقتول چند دوکانوں کے مالک تھے اچھا خاصا پیسہ چھوڑ کر گئے ہیں۔ ان کی موت کے بعد وہ پیسہ کس کو ملا ہے؟“

”وہ شرعاً تقسیم کیا گیا ہے۔“ خاتون سنجیدگی اور بردباری سے بولی۔

”چونکہ آپ کی کوئی اولاد نہیں تھی تو وہ رقم آپ کے اور مقتول کی بہن کے حصے میں آئی ہوگی۔“

”جی ہاں۔“

”مقتول کی بہن کے شوہر آپ کے بھائی ہیں۔ وہ پچھلے ماہ گواہی دینے کے لئے آئے تھے۔ وہ مقتول کے سالے اور بہنوئی دونوں ہیں۔ کیا یہ درست ہے کہ آپ کی وٹے شے کی شادی تھی؟“

”جی۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قمر الدین صاحب کی تمام پراپرٹی آپ کو اور آپ کے بھائی کو ملی ہے۔“ سمجھنے والے انداز میں سر ہلاتے

۱۔ امر نے سادگی سے پوچھا۔

”آپ جیکشن یور آنر؟“ پراسیکیوٹر تیزی سے اٹھا۔

”سٹینڈ!“ جج صاحب نے تنبیہ بھری نظر زمر پہ ڈالی۔

”مسز قمر الدین۔“ وہ گہری سانس لے کر اس کی طرف گھومی۔ ”کیا آپ کا اور قمر الدین صاحب کا کوئی جوائنٹ بینک اکاؤنٹ

”جی۔“

”جی ہے۔“ وہ چونکی تھی۔

”اور کیا جن دنوں قمر الدین صاحب جیل میں تھے آپ نے ایک خطیر رقم نکلو اور اپنے بھائی کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کی تھی؟“ اس

۲۔ ہند کا غدا تباری باری نج اور پراسیکیوٹر کے سامنے رکھے اور ایک کاپی گواہ کو تھمائی۔ خاتون ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

”مسز قمر الدین... کیا یہ درست ہے کہ جب قمر الدین کو اس خطیر رقم کے ٹرانسفر کا علم ہوا تو بینک آفس میں بیٹھے انہوں نے آپ کے

۳۔ مہالی کے ساتھ جھگڑا کیا؟“

”جی۔ درست ہے۔“ نگاہیں جھکا دے وہ بولی۔

”اور اس جھگڑے میں آپ کے بھائی نے قمر الدین صاحب کو شدید برا بھلا کہا۔ اور اس جھگڑے کے ڈیڑھ ماہ بعد قمر الدین

صاحب کا قتل ہو گیا۔ کیا یہ درست ہے؟“

”جی۔“ وہ ہلکا سا بولی۔ نگاہیں بدستور جھکی تھیں۔

”مجھے مزید کوئی سوال نہیں پوچھنا۔“ وہ کورٹ کو ایک اور suspect دے کر آرام سے مڑ کر اپنی کرسی کی طرف چلی آئی تھی اور

۴۔ پہلے سے بہتر نظر آرہی تھی۔ البتہ فارس نے ہلکے سے سرگوشی کی۔ ”پراسیکیوٹر نے آپ جیکٹ نہیں کیا۔“

زمر چونکی۔ فارس تکیھی نظروں سے پراسیکیوٹر کو دیکھ رہا تھا جو سارا وقت خاموش بیٹھا رہا تھا اور اب گواہ کو re-examine کرنے اٹھ رہا

تھا۔ ایک دم سے زمر کو احساس ہوا، خرابیء طبیعت کے باعث آج اس کا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔

”مسز قمر الدین۔“ وہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ”آپ نے وہ رقم کیوں نکلوئی تھی؟“

زمر ابرو اکٹھے کیے آگے ہو کر بیٹھی۔

خاتون خاموش رہی۔

”مسز قمر الدین اگر آپ جواب نہیں دیں گی تو فاضل عدالت کے سامنے آپ کا اور آپ کے بھائی کا کردار مشکوک ہو جائے گا۔“

”میں....“ وہ رکی۔ ”ایک سال پہلے مجھے بریٹ کینسر ڈائیگنوز کیا گیا تھا۔ یہ رقم اس کے علاج اور سرجری کے لئے نکلوئی تھی میں

نے۔ قمر الدین صاحب کو پریشانی سے بچانے کے لئے لاعلم رکھا تھا۔ میرا بھائی ہر لمحے میرے ساتھ رہا تھا۔“ نگاہیں جھکائے وہ بولی تو آنکھوں

سے آنسو گرنے لگے۔

زمر نے کراہ کر آنکھیں میچ لیں۔ پراسیکیوٹر اب اس کی میڈیکل رپورٹس عدالت میں جمع کر رہا تھا۔ پھر مڑ کر فاتحانہ انداز میں زمر

کو دیکھا۔

”کیا آپ ری کر اس کرنا چاہیں گی گواہ کو؟“

”تو ٹھیکس۔“ وہ تلخی سے کہہ کر کاغذ پہ لکیریں کھینچنے لگی۔ فارس نے دیکھا، وہ صرف ٹکونیں بنا رہی تھی۔ آج کا دن اس کے لئے بہت برا ثابت ہو رہا تھا۔



یقین حرفِ دعا، بے یقین موسم میں بہت کٹھن تھا بچانا مگر بچایا ہے ہوٹل کے کچن کی ویران پڑی پیٹنری کے دروازے سے اندر جانے کے بعد فصیح آبدار کو راہداری میں آگے لے آیا۔ ایک سیکہ رلی چیک پوائنٹ پہ وہ رکا۔

”بس، آپ اپنا پرس، سیل فون، کچھ بھی نیچے نہیں لے جاسکتیں۔ میں معذرت خواہ ہوں، مگر ہارون صاحب آپ پہ بھی بھروسہ نہیں کرتے۔“

سفید لمبا سویٹر پہنے اور سرخ اسکارف میں ملبوس آبی نے ایک چھتی ہوئی نظر اس پہ ڈالی اور میز پہ اپنا پرس الٹایا۔ چابیاں، قلم، موبائل، لپ اسٹک۔ کریڈٹ کارڈ۔ سب کچھ میز پہ گر اٹھا۔ اب وہ ہاتھوں سے انگوٹھیاں اتارنے لگی۔ فصیح شرمندہ ہو کر ”نہیں، اس کی خیر ہے۔“ کہنے لگا مگر آبدار نے اسی خاموشی سے انگوٹھیاں میز پہ پٹنیں، کڑا اتارا، گھڑی کھول کر وہاں رکھی۔ اسکارف تلے ہاتھ ڈال کر چین نوچ کر اتاری۔ دوبارہ اسکارف تلے ہاتھ ڈالا اور اب سر کی بن اتاری۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھائے۔ ”کیا تمہاری تسلی ہوگئی کہ اب میں کلیئر ہوں؟“ اور واک تھرو گیٹ سے گزری۔ کوئی سائرن نہیں بجا۔ وہ ہر دھات سے پاک تھی۔ پھر مڑی اور اسی خستگین نظر سے فصیح کو دیکھتے ہوئی۔ ”اب اگر تمہاری اجازت ہو تو میں اس کا انٹرویو نوٹ کرنے کے لئے نوٹ بک اور پین اٹھاؤں؟“ کہتے ہوئے اپنی چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

”آف کورس بس!“

آبی نے اسی برے موڈ سے نوٹ بک اٹھائی، سنہری پین اٹھایا اور پھر اس کی طرف بڑھایا۔ ”ان کو بھی چیک کر لو تا کہ کل کو اگر وہ بھاگ جائے تو تم مجھ پہ الزام نہ دھر سکو۔ لو چیک کر لو۔“

”میں صرف حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ آئی ایم سوری۔“ سینے پہ ہاتھ رکھے، سر کو خم دے کر بولا اور آگے بڑھ گیا۔ آبی قلم اور نوٹ بک پکڑے اس کے پیچھے ہوئی۔

جب سعدی یوسف کو اس کے سامنے لا بٹھایا گیا تو وہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ سعدی بھی خاموش مگر اکھڑا اکھڑا سا لگتا تھا۔ وہی سفید شرٹ پہنے جواب دھل دھل کر بے رنگ ہو چکی تھی، وہ ابرو دھنچنے اسے دیکھ رہا تھا۔ خاموش بالکل چپ۔ فصیح آبدار کے پیچھے آکھڑا تھا۔

”مجھے تمہارے Near Death Experience کے بارے میں چند سوال کرنے ہیں۔“ خشک لہجے میں کہتے ہوئے اس نے نوٹ بک کھول کر قلم اس پہ جمایا، اور پیچھے سے دبایا۔ نب نکل آئی اور اس نے بک پہ چند الفاظ لکھے۔ پھر اس کی خاموشی محسوس کر کے سر اٹھایا۔

”مجھے ہاشم سے بات کرنی ہے۔ یہاں کوئی میری اس سے بات نہیں کروا رہا۔ یہ کہتے ہیں اس کا فون آف ہے۔“ ساتھ ہی ایک کٹیلی نظر پیچھے کھڑے فصیح پہ ڈالی۔

آبدار نے گہری سانس لی اور نگاہیں اس پہ جمائے رکھے وہ بولی۔ ”تمہاری سرجری کے دوران خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے تم clinically مر چکے تھے۔ میں جانتا چاہتی ہوں کہ اس دوران تم نے کیا محسوس کیا؟“

”یہ لوگ مجھے مار دیں گے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے چینی سے مگر ضبط سے بولا تھا۔ ”ہاشم کو بتاؤ کہ یہ مجھے مار دیں گے۔“

”تم نے کیا دیکھا؟ کوئی خواب؟ کوئی چہرہ؟ یا کوئی ایسا سفر جو تم بیان نہ کر سکتے ہو۔“

”تم میری مدد کرو گی یا نہیں؟“ وہ سن رہی تھی وہ اب کے بولا تو آواز بلند تھی۔ چہرے پہ دکھ تھا۔

”میں..... نیوٹرل ہوں۔“ اس نے کلک کے ساتھ پین بند کر دیا۔ اور نوٹ بک پہ رکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔

”ایک گھنٹے بعد میری فلائٹ ہے۔ میں مزید تمہاری باتیں برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر کچھ یاد آجائے تو اس پہ لکھ دینا۔ اور کسی گارڈ کو

دے دینا، وہ مجھ تک پہنچا دے گا۔“

فصح آبی کی پشت پہ کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ الفاظ کہتے ہوئے آبی نے ابرو سے قلم کی طرف اشارہ کیا، گویا التجا کی کہ اسے پکڑ لو۔ سعدی نے لمبے بھر کا تامل کیے بغیر قلم اور نوٹ بک تھام لی۔ پر باری باری ان دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ آبدار سنجیدہ سی اٹھ گئی۔

”چلو فصیح۔ اگر زیادہ دیر بٹھری تو مجھے تمہارے قیدی پہ ترس آجائے گا۔“ بے نیازی سے کہہ کر وہ باہر جانے لگی جب فصیح رکا۔

”ایک منٹ۔ مجھے اس کو چیک کرنے دو۔“ وہ سعدی کی طرف بڑھا۔ آبی منجمد ہو گئی۔ سانس تک رک گیا۔

فصح نے سعدی کے ہاتھ سے نوٹ بک لی اور اسے کھولا۔ اچھی طرح کنکھالا۔ صفحے پلٹائے۔ ان کو سونگھا۔ (کوئی نا دیدہ انک ہو

شاید۔) پھر مطمئن ہو کر بک واپس کر دی اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔ آبی کی جان میں جان آئی۔

فصح کو اس پہ شک نہیں تھا کیونکہ یہ پہلی دفعہ نہیں تھا جب آبدار اپنے کسی مریض کو نوٹ بک اور قلم دے آئی تھی۔ فصیح اس کے ساتھ کئی

دفعہ ایسا ہی منظر دیکھ چکا تھا جب مریض بتانے سے زیادہ لکھنا پسند کرتے تھے۔ بعد میں وہ فصیح کو نوٹ بک واپس لانے کے لئے بھیجتی تھی۔ اب

بھی باہر راہداری میں آگے بڑھتے ہوئے اس نے فصیح سے کہا تھا۔

”جب وہ مر جائے تو میری نوٹ بک واپس لے آنا۔“

اور اندر اپنے خالی کمرے میں بیٹھا سعدی دیوانہ وار نوٹ بک کے صفحے پلٹا رہا تھا۔ وہاں آبی کے نوٹ کردہ چند NDEs لکھے

تھے۔ سعدی بے قراری سے ان الفاظ میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ کوئی پیغام، کوئی کوڈ۔

جبکہ سنہری چمکتا ہوا پین لاپرواہی سے میز پہ رکھا تھا۔



شکیب اپنے تعارف کے لیے یہی بات کافی ہے ہم اس سے بچ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے

قصر کاردار کی انیکسی میں اس صبح شور و غل برپا تھا۔ صداقت کا ختم کر کے اپنے کوارٹر میں چلا جاتا تھا، آج بھی باہر تھا۔ حسینہ فارغ

سی لاؤنج میں چوکی کھینچ کر بیٹھی گاہے بگاہے کچن کو دیکھتی۔ اور ادھر ادھر ٹہلتیں ندرت بھی تو کچن کو ہی انگارہ آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر ہول رہی

تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا، حنین کو کچا چبا جائیں۔

حسینہ سمیت سب کو وہاں سے نکال کر وہ اپن کچن میں کاؤنٹر ٹاپ کے اوپر چڑھی کھڑی تھی۔ آستین چڑھائے، دوپٹہ کسے، بال

باندھے، وہ کچن کو de-clutter کر رہی تھی۔ گند سے پاک۔

جب ندرت کو معلوم ہوا کہ اپنا کمرہ حنین نے صاف کیا تھا، تو کافی خوش ہوئیں۔ حیران بھی۔ جتایا بھی (آج کہاں سے خیال آ

گیا؟) مگر چلو اچھا ہے۔ اس کو بھی احساس ہوا گھر داری کا۔ یہاں تک ٹھیک تھا مگر جب آہستہ آہستہ دراز کھلنے پہ معلوم ہوا کہ.... آدھے سے

زیادہ سامان جنین بی بی گھر سے باہر کر چکی ہیں تو ندرت پہلے حیران اور پھر غصہ ہوئیں۔ حالانکہ جنین نے کام کی کوئی چیز نہیں پھینکی تھی۔ ماؤں والی عادت کہ انیس سوستر کی دہائی کی بھی سونیاں دھاگے سنبھال کر رکھیں گی کہ شاید قیامت سے پہلے کبھی کام آجائے۔

چلو یہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ مگر جب وہ پچھلے دو ہفتوں کے دوران باری باری ہر کمرہ (ماسوائے زمر کے کمرے کے) صاف کر گئی تو ندرت کو غصہ آنے لگا اور آج صبح جب اس نے کچن میں قدم رکھا، یعنی کہ ان سب کو باہر نکالا تو ندرت ذوالفقار خان کے لئے برداشت کرنا ناممکن ہو گیا۔

”ہر چیز ہلا دو گی، پھینک دو گی، وہ کیبنٹ کیوں کھول رہی ہو؟ اُف یہ مسالوں کے ڈبے کیوں نکال رہی ہو؟“ وہ وہیں اُٹھ ہوئے (جنہ کا اتنا رعب تو تھا کہ منع کر دیا تو اب کچن میں نہیں جانا۔) بار بار پریشانی سے اسے پکارتیں۔

مگر جنین پرسکون تھی۔ گھٹنوں کے بل کاؤنٹر ٹاپ پہ بیٹھی، اوپری کیبنٹ سے چیزیں نکال نکال کر کاؤنٹر پہ رکھ رہی تھی۔ ”میں کوئی بھی کام کی چیز نہیں پھینکوں گی امی۔ صرف ایکسپائرڈ مصالحے کے پیکٹ نکال رہی ہوں۔ شیشوں والے مصالحے، کر، شیشیاں دھو کر، سکھا کر واپس ڈال دوں گی۔ اندر پڑے سارے برتن دھونے ہیں۔ گند نکالنا ہے۔ صاف اخبار بچھا کر، ہر چیز سیٹ رکھنی ہے۔“

”ہاں، بھئی ماں تو پھو ہڑ ہے، ماں کو تو کچھ آتا ہی نہیں۔ تین بچے پال کر بڑے کیے جاب بھی کی، گھر بھی سنبھالا، مگر نہیں۔۔۔“ وہ بیٹوں کے بل بیٹھی، کیبنٹ پہ ہاتھ رکھے مڑ کر ندرت کو دیکھنے لگی۔ ”پتہ ہے کیا امی، ہر عورت کے اندر ایک شدید پوزیو قسم کی ہوتی ہے۔ جیسے وہ اپنی ساس یا اپنی بہو کی خود مختاری اپنے گھر میں نہیں برداشت کرتی، اسی طرح وہ اپنی بیٹی کی خود مختاری بھی نہیں برداشت کرتی۔ آپ مائیں یہ تو چاہتی ہیں کہ بیٹی بستر سے اٹھے تو چادر درست کر کے اٹھے، مہمانوں کے سامنے چائے دینے کا سلیقہ آتا ہو، مختلف پانا بنا سیکھ لے، پنا کمرہ صاف رکھا کرے، تاکہ لوگ اس کی تعریف کریں، مگر جب بیٹی نے اپنی مرضی سے گھر سیٹ کرنا چاہا، وہاں آپ نے اندام عورت جاگ گئی۔ اسی لئے لوگوں نے ”ہاؤس وائف“ یا ”ہاؤس کیپر“ کی ٹرم بنائی، کہ صرف گھر کے صاحب کی بیوی یا گھر کی نوکرانی ہی کمرہ کی چیزوں کو رکھنے اور چھیڑنے میں خود مختار ہوتی ہیں۔ مگر اب وہ دور ختم ہوا۔ آج سے جنین یوسف ایک نئی ٹرم ایجاد کرتی ہے۔ ہوم گرل۔ گھر کی لڑکی، کو گھر کے کام سیکھنے چاہیے، اگلے گھر کے لئے نہیں، بلکہ اپنے گھر کے لئے، ہر وہ گھر جہاں وہ رہے۔“

اور اگر حسینہ سامنے دانت کھتی سن نہ رہی ہوتی تو ندرت کا ہاتھ بار بار جوتے تک جا کر کرک نہ جاتا۔

قریباً تین گھنٹے بعد وہ دھلے دھلائے کچن کے سامنے تھکن سے چور کھڑی تھی۔ اب کچن کیپینٹس اندر سے بھی صاف اور نرم ہیں، تھیں۔ سب اس نے خود کیا تھا۔ یہ نوکرانیوں کے کرنے کے کام نہیں ہوتے۔ امی کی سو سولواتیں سن کر بھی بہری بنی "clutter" "charity" کے بڑے بڑے شاپر باہر کوڑے کے ڈبے میں ڈال کر آئی۔ اب بس ایک کام رہ گیا تھا۔ اپنے بیڈروم کی ایک دودرازیں اس نے چھوڑ دی تھیں اس روز۔ اب ان کو نکال کر لاؤنج میں لے آئی اور ان میں سے ضروری، کچرا اور خیرات کا سامان الگ الگ کرنے لگی۔ امی ویسی ہی بے حال، بندھے بالوں اور تھکے چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی، اور گودی میں رکھے پرس کھول کھول کر دیکھ رہی تھی جب بڑے بابا اپنی ذلیل، دھکیلتے قریب میں آکر خاموشی سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔

وہ مگن سی پرس خالی کر رہی تھی۔ یہ اس کے سارے پرس تھے۔ دفعتاً وہ رکی۔ ٹھکی۔ ایک پرس میں سے پانچ سو کا نوٹ نکلا۔ ”کھولا تو پچاس اور بیس بیس کے نوٹ تھے۔ ایک میں چند سکے تھے۔ اس نے خوشگوار حیرت سے سراٹھایا۔“ مجھے تو یاد بھی نہیں تھا کہ یہ پرانے پرسز میں پیسے پڑے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے۔“

”یہ اتفاق نہیں ہے۔“ ابا مسکرائے۔ ”یہ تھنہ ہے۔“

”تھہ؟“ وہ چونکی۔

”جب چھوٹی تھی تو سنتی ہوگی کہ دنیا میں صرف انسان اور جانور living things ہوتے ہیں۔ بڑی ہوئی تو پتہ چلا ہوگا کہ پودے اور درخت بھی جاندار ہیں۔ گردین پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر پتھر ہر دیوار سب جاندار ہیں۔ قیامت کے دن گواہی دیں گے نایہ پتھر یہ گھر یہ جگہیں۔ کچھ محسوس کرتے ہیں، سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، تبھی گواہی دیں گے نا۔ اسی لئے زمین پہ آہستہ آہستہ اور تیز سے چلنا چاہیے۔ اسی لئے کچھ پتھر اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور یاد ہے ایک پتھر رسول پاک ﷺ کو بھی سلام کیا کرتا تھا۔ اسی لئے ان چیزوں کے سائے جھکے ہوئے اللہ کو سجدہ کر رہے ہیں۔ یہ سب لیونگ تھنگز ہیں۔ تمہیں دیکھتی ہیں، محسوس کرتی ہیں۔“ وہ لچلے بھر کور کے۔ ”جب کوئی لڑکی اپنی الماری کا اپنے کمرے کا خیال کرتی ہے اس کے اندر کا زائد بوجھ نکال کر اس کو ہلکا پھلکا اور صاف کرتی ہے، خوبصورت بناتی ہے، تو یہ الماریاں تمہارا شکر یہ ادا کرتی ہیں اور ان کے کونے کھدروں سے کوئی نہ کوئی تحفہ نکل آتا ہے۔ کبھی کوئی پرانی کھوئی ہوئی چیز، کبھی برسوں کے بھولے ہوئے پیسے۔ اس لئے ان درود پوار کا ان چیزوں کا خیال رکھا کرو۔ یہ بھی تم سے پیار کریں گی۔ جنات اور انسانوں کے علاوہ باقی ساری مخلوق بہت احسان ماننے والی، بہت قدر کرنے والی ہے۔“

حنین نے متحیر سی ہو کر ان پیسوں کو دیکھا، پھر ابا کو۔ اس کے اوپر جیسے ایک نیا انکشاف ہوا تھا۔ اسی ٹرانس کی سی کیفیت میں وہ بولی تھی۔

”ابا، کوئی کہتا ہے لڑکیاں خلاء اور چاند تک پہنچ رہی ہیں، کوئی کہتا ہے وہ کورٹ، ہسپتال، فوج، ہر میدان کو فتح کر رہی ہیں۔ اب میں سوچتی ہوں کہ کتنا اچھا ہوا اگر لڑکیاں اپنے گھروں کے کونوں کھدروں تک بھی پہنچ جائیں۔ اگلے گھر جانے کے لئے نہیں، دوسروں سے تعریف سننے کے لئے بھی نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے کہ صفائی کے بغیر ایمان آدھا ادھورا ہوتا ہے، اور اس لئے کہ فرشتے صاف جگہوں پہ آتے ہیں۔ جب ہمارے گھر اندر سے اتنے گندے ہوں گے الماریوں کے اندر دنیا جہاں کا گند سڑ رہا ہو گا، ڈسٹ بن کچرے سے اہل رہے ہوں گے تو کیا فرشتے ہمارے گھروں میں آنا پسند کریں گے؟“ وہ اب سر جھکائے خود سے بولتی پرس الٹا رہی تھی۔ ایک پانچ روپے کا سکہ گود میں گرا۔ وہ مسکرا دی۔ اس کو اب زمر، اسامہ یا ندرت کی تعریف کی ضرورت نہیں تھی۔

اس کا گھر اس کی الماریاں اس کے درود پوار تو واقف تھے ناس کی محنت سے۔ وہی اس کو شکر یہ کہہ رہے تھے۔ حنین یوسف کے لئے یہی بہت تھا۔



ہر چند راکھ ہو کے بکھرتا ہوں راہ میں جلتے ہوئے پروں سے اڑا ہوں مجھے بھی دیکھ ملاقاتی ہال میں معمول کا شور وغل برپا تھا۔ گلاس بوتھ کے دونوں طرف فارس اور زمر بیٹھے تھے۔ درمیان میں شیشہ تھا جس میں ننھے ننھے سوراخ تھے۔ ساتھ میں قطار میں دو درجن بوتھ لگے تھے۔ ایک طرف قیدی تھے دوسری جانب ان کے عزیز واقارب جو ان سے ملاقات کر رہے تھے۔ وہ سر جھکائے، سنجیدہ اور خاموش سی بیٹھی تھی۔ فارس نے انگلی سے شیشہ کھٹکھٹایا۔ زمر نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

”پریشان ہو؟“

زمر نے سر جھٹکا اور فائل کھولی۔ کان کے پیچھے بال اڑتے سر جھکائے اب وہ کہہ رہی تھی۔ ”پراسیکیوٹر نے بہت سے گواہ give up کر دیے ہیں۔ جب وکلاء چاہتے ہیں کہ کوئی کیس جلد از جلد چلے تو وہ کم سے کم گواہ پیش کرتے ہیں۔ میری یہی اسٹریٹیجی تھی۔ مگر میں تمہارے گواہی دینے سے خوش نہیں ہوں۔ خیر۔ تم فیصلہ کر ہی چکے ہو تو تمہیں witness پر پکڑ کرانی ہے۔ وقت کم ہے۔“ کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی اور سر اٹھا کر فارس کو دیکھا۔ ”جب وہ کوئی ایسا سوال پوچھیں جس کا جواب نہ دینا چاہو تو چار لفظ بول دینا۔ I don't recall۔“

مجھے یاد نہیں۔ قانوناً یہ جھوٹ نہیں ہوتا۔ اور جب وہ تم سے پوچھیں کہ اس رات تم کہاں تھے تو کہنا ”میں نے بہت دفعہ بتایا ہے کہ میں اس رات گھر تھا۔“ اب یہ سچ ہے کیوں کہ تم بہت دفعہ کہہ چکے ہو کہ تم اس رات گھر پہ تھے۔ تمہاری بہت دفعہ کہی بات سچ تھی یا جھوٹ؟ یہ الگ بات ہے۔“

”اوکے۔“ اس نے سر کو خم دیا۔ اب وہ اس سے سوال پوچھنے لگی۔

”فارس غازی کیا آپ کے اور قمر الدین صاحب کے درمیان کوئی دشمنی تھی۔“

”مجھے یاد نہیں۔“ وہ پرسکون سا بولا۔

”کیا آپ نے قمر الدین کو جیل میں پینا تھا۔“

”مجھے یاد نہیں۔“

”گلد۔“ وہ ذرا سا مسکرائی۔ اب بہتر نظر آنے لگی تھی۔ ”کیا آپ نے قمر الدین کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی؟“

”نہیں۔“

”آپ 28 اور 29 اگست کی رات کہاں تھے؟“

”جیسا کہ میں بہت دفعہ بتا چکا ہوں میں اس رات گھر پہ تھا۔“ تاہم یہ انداز میں ابرو اٹھائی۔ زمر نے مسکرا کر سر ہلایا۔

”کیا آپ پوری رات گھر پہ تھے؟“

”مجھے یاد نہیں۔“ وہ سلجھے ہوئے انداز میں جواب دے رہا تھا۔ زمر کی رنگت واپس آ رہی تھی۔ وہ کٹہرے میں کھڑے کوئی غلط بات

نہیں کرے گا۔ اس کی امید بڑھنے لگی تھی۔ مگر..... وہ فارس تھا۔ اس پہ اعتبار کیوں نہیں ہوتا تھا؟



ٹھوکر سے میرا پاؤں تو زخمی ہوا ضرور..... رستے میں جو کھڑا تھا، وہ کہسار ہٹ گیا وہ صبح سرد اور غلام تھی۔ خاموش اور بے حس۔ آج کمرہ عدالت میں بیٹھے فارس غازی نے سیاہ پینٹ کے اوپر گرے شرٹ اور سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا۔ تازہ شیوڈرا بڑھے بال گیلے کر کے پیچھے کو بنائے وہ سنجیدہ مگر مطمئن نظر آ رہا تھا۔ ساتھ بیٹھی سیاہ کوٹ اور گھنگریالے بالوں والی زمر کا چہرہ زرد تھا۔ اتنے ہفتوں کی ان تھک محنت اور ذہنی دباؤ نے اسے اپنی صحت کی طرف سے غافل کر رکھا تھا، آج بھی وہ پہلے سے کمزور نظر آتی تھی۔ پچھلی کرسی پہ سیاہ کوٹ میں ملبوس احمر شفیع بیٹھا تھا۔ اس کی لاء ڈگری اور لائنسنس کے باعث اسے ادھر بیٹھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ (زمر کو ننانوے فیصد یقین تھا کہ اس کی ڈگری جعلی تھی، مگر اپنے دفاع میں وہ صرف اتنا کہتا تھا کہ بغیر لاء ڈگری کے وہ سیاسی کنسلٹنٹ، ان ہی نہیں سکتا تھا، اور چونکہ بات درست تھی اسی لئے وہ باز پرس نہیں کرتی تھی۔)

جب فارس اٹھنے لگا تو زمر نے بے چینی سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”بہت احتیاط سے گواہی دینا۔ پلیز، کچھ غلط مت کرنا۔“

وہ اٹھتے اٹھتے واپس بیٹھا اور اسی سنجیدگی سے زمر کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”میں نے ساڑھے تین مہینے کچھ نہیں کیا۔ جو تم نے کہا، وہ

کیا۔ ایسا ہی ہے نا؟“

زمر کا سر اثبات میں ہلا۔

”میں یہاں خاموشی سے بیٹھ کر وکیلوں کی بے کار بحثیں سنتا رہا۔ ایسا ہی ہے نا؟“

زمر نے اس کی آنکھوں پہ نظریں جمائے اثبات میں سر ہلایا۔

”اب میرے بولنے کا وقت ہے اور ان سب کے سننے کا۔“ کہتے ہوئے اس نے زمر کے پیچھے کسی کو دیکھا۔ ”یہ کون ہے؟“

زمر نے چونک کر گردن پھیری تو استغاثہ کی کرسیوں پہ بیٹھے، قیسی نفیس سوٹ میں ملبوس آدمی کو دیکھ کر وہ ٹھہر گئی۔
 ”یہ تو سابق پراسیکیوٹر جنرل ہیں۔ یہ ادھر کیسے؟“ فارس لاعلمی سے شانے اچکاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ زمر نے گھوم کر احمر کو دیکھا جو نگاہیں اوپر چبوترے پہ جمائے بیٹھا تھا۔ ”پراسیکیوٹر جنرل ادھر کیا کر رہے ہیں، احمر؟“
 ”مجھے نہیں معلوم۔ غازی نے کہا تھا، ان کو بلاؤ، میں نے صرف اتنا کیا ان کی موجودگی یہاں یقینی بنائی۔“
 ”فارس نے کہا تھا؟“ وہ متعجب رہ گئی، پھر واپس گھومی۔ اور الجھن سے فارس کو دیکھا جو کٹھنرے میں کھڑا حلف لے رہا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ساری باتیں ذہن سے جھٹک کر گواہی لینے لگی۔
 ”ریکارڈ کے لئے اپنا نام بتائیے۔“ اس نے خشک لہجے میں مخاطب کیا۔ وہ ہلکا سا مسکرا کر بولا۔ ”فارس طہیر غازی۔“ نظریں زمر پہ جمی تھیں۔

”کیا یہ درست ہے کہ آپ کو 13 اکتوبر کی شام اپنے گھر سے گرفتار کیا گیا؟“
 ”جی۔“ وہ اب اس سے چند روٹین کے سوالات کر رہی تھی۔ اور وہ مختصر جواب دے رہا تھا۔ آخر میں اس نے پوچھا۔
 ”کیا آپ حلفیہ کہتے ہیں کہ آپ کا قمر الدین چودھری کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے؟“
 ”جی ہاں۔ میں نے یہ قتل اور انوائس کیا۔ میں بے گناہ ہوں۔“
 زمر مڑی اور پراسیکیوٹر کو "your witness" کہہ کر مخاطب کرتی اپنی کرسی پہ آ بیٹھی۔ پراسیکیوٹر لبوں پہ معنی خیز مسکراہٹ سجائے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
 ”فارس غازی، آپ نے ابھی کہا کہ آپ مقتول کو جیل کے زمانے سے جانتے تھے۔ کیا آپ دونوں کے درمیان کوئی دشمنی، کوئی رقابت تھی؟“

”مجھے یاد نہیں۔“ کٹھنرے پہ ہاتھ رکھے کھڑے وہ پراسیکیوٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پرسکون سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔
 ”کیا آپ کو یہ یاد ہے کہ آپ نے قمر الدین چودھری کو پٹیا تھا؟“
 ”آئی ڈونٹ ری کال۔“
 پراسیکیوٹر نے مسکرا کر سر جھٹکا۔ ”کیا قمر الدین کے جیل سے چھوٹنے کے بعد آپ کا اس سے کوئی جھگڑا ہوا تھا؟“
 ”مجھے یاد نہیں۔“

”آپ 28 اور 29 اگست کی درمیانی رات کہاں تھے؟“
 ”میں رات نو بجے گھر آ گیا تھا اور اگلی صبح ساڑھے سات بجے گھر سے نکلا تھا۔“ زمر نے بے اختیار اسے دیکھا۔ وہ مختلط الفاظ کا چناؤ کر رہا تھا۔ گردن موڑ کر اس نے پراسیکیوٹر جنرل کو دیکھا۔ وہ انگوٹھے کے ناخن سے انگشت شہادت کا ناخن رگڑتے، توجہ سے اس کو دیکھ رہے تھے۔

”کیا آپ پوری رات گھر پہ رہے تھے؟“ پراسیکیوٹر نے وہ سوال پوچھا جس کا زمر کو دھڑکا تھا۔
 ”مگر عدالت میں چند ثانیے کے لیے سناٹا چھا گیا۔ پھر فارس طہیر غازی نے انھی گردن اور سنجیدہ چہرے کے ساتھ کہا۔
 ”نہیں۔“

زمر کا دل لمحے بھر کے لئے رکا۔ احمر بے اختیار سیدھا ہو کر بیٹھا۔ پراسیکیوٹر بھی دو قدم مزید قریب آیا۔
 ”تو آپ اس رات.... کہیں جا کر واپس آئے تھے؟“ پراسیکیوٹر کو ”مجھے یاد نہیں“ کی توقع تھی، وہ خود بھی حیران ہوا تھا۔

”میں گیارہ بجے گھر سے نکلا تھا اور صبح پانچ بجے واپس آ گیا تھا۔“

زمر نے بے اختیار سردوٹوں ہاتھوں میں گر ادیا۔

”آپ گیارہ سے پانچ کے دوران کدھر گئے تھے؟“

فارس نے ایک علاقے کا نام لیا جو ڈاکٹر ایمن کے ہسپتال کے قریب تھا۔

”یہ علاقہ قمر الدین کے قتل کی جگہ سے کافی دور ہے۔ میں پوری رات اسی علاقے میں تھا۔“ وہ پرسکون سا کہہ رہا تھا۔ زمر کو نہیں

آئی وہ کس بات پہ اعتراض کرے۔ اس کا گواہ اپنے ہی خلاف hostile witness بن رہا تھا۔

”اور آپ وہاں کس جگہ تھے؟“

وہ لمحے بھر کو رکا۔ ”میں ایک عمارت میں گیا تھا۔“

”اور کیا وہ کوئی خالی عمارت تھی؟ کوئی زیر تعمیر ہسپتال؟ کوئی فیکٹری؟ جہاں آپ کی alibi ثابت کرنے کے لئے ایک شخص بھی

ہو۔“ پراسیکیوٹر کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ بکھری۔

”وہاں 32 لوگ تھے جنہوں نے مجھے ادھر دیکھا پوری رات۔ میرے پاس 32 alibis ہیں۔“

جہاں پراسیکیوٹر لمحے بھر کے لئے لا جواب ہوا وہاں زمر نے چونک کر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اسی طرح پرسکون کھڑا تھا۔ پرایا

جزل نے کراہ کر آنکھیں میچیں۔

”32 لوگ؟“ پراسیکیوٹر قدرے ہکا کر سنبھلا۔ ”یہ کون سی جگہ تھی۔“

”یہ ایک... ایک میننگ پلیس ہے۔ ملاقات کی جگہ۔ بور ہوئے لوگ ادھر جاتے ہیں۔“

”اور آپ ادھر کیوں گئے تھے؟“

”میں... کافی پینے گیا تھا۔“ وہ تازہ دم مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ پراسیکیوٹر کو سمجھنے میں چند لمحے لگے۔

”آپ کا مطلب ہے یہ کوئی باریا کلب جیسی جگہ ہے۔“

”جی۔“

”تو... وہاں لڑکیاں بھی ہوں گی؟“ پراسیکیوٹر نے اب کے مسکرا کر زمر کو دیکھا۔ ”کیا آپ کسی لڑکی کے ساتھ تھے۔“

”وہاں... لڑکیاں... نہیں ہوتیں۔ صرف مرد ہوتے ہیں۔“ وہ الفاظ توڑ توڑ کر بولا تھا۔ لمحے بھر کو کمرہ عدالت میں خاموشی چھا گئی

زمر کو اپنے کانوں سے دھواں نکلتا محسوس ہوا۔ نچلاب دانتوں تلے دبائے وہ بالکل سن سی فارس کو دیکھ رہی تھی۔

”اچھا... آئی سی... سو... آپ اس کلب میں تھے؟ پوری رات؟“

”پراسیکیوٹر صاحب وہاں 32 لوگ... 32 مرد اس رات موجود تھے۔ کلب کی لابی کی سی سی ٹی وی فوٹیج میں میرے آگے پہلے

داخل ہونے والے 32 لوگوں کے چہرے بھی نظر آرہے ہیں۔ کچھ کے تو نام بھی مجھے یاد ہیں۔ جو کولمبیا سے پڑھ کر آیا ہے... اور ایک بڑا

سرکاری عہدیدار کا بیٹا ہے... وہ بار کا ڈنسر پہ میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا... اس کا بازو فریکچر ہوا تھا اور...“

زمر نے بے اختیار گردن موڑ کر پراسیکیوٹر جزل کو دیکھا جن کی نظریں فارس غازی پہ گڑی تھیں اور کان سرخ تھے۔ ادھر وہ پرانے

سا کہہ رہا تھا۔ جج صاحب ایک دم چونک کر فارس کو دیکھنے لگے تھے۔

”آپ پراسیکیوٹر صاحب... ان 32 لوگوں کو subphona کریں، کورٹ بلائیں اور میری alibi کی تصدیق کر لیں، میں

آپ کو ان کے نام دینے کے لئے تیار ہوں۔ آپ نے مجھے گرفتار ہی ان لوگوں کے ناموں کے لئے کیا ہے نا، تو مجھ سے نام پوچھیں۔“ سائیکو

سے جج صاحب کی طرف دیکھا۔

”بالکل آپ ان کے ناموں کی فہرست عدالت میں جمع کروائیں۔ عدالت ان کو باری باری طلب کر کے سوال جواب کر لے گی۔“

پراسیکیوٹر کا اعتماد واپس آنے لگا۔

”یور آزا“ وہ ایک دم کھڑی ہوئی۔ اب کچھ کچھ اسے سمجھ میں آنے لگا تھا۔ ”فارس غازی ان لوگوں کی فہرست عدالت کے حوالے نہیں کر سکتا کیونکہ... کیونکہ وہ عزت دار لوگ ہیں۔ اگر ان کو subpheona کیا گیا تو یہ ان کی توہین ہوگی۔ جیسے ایک سابقہ سرکاری آفیسر کا بیٹا جس کا بازو فریکچر ہوا تھا وہ جج بننے جا رہا ہے اس گواہی سے اس کا کیریئر... متاثر ہوگا۔“ وہ جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔ پراسیکیوٹر نے جھلکا کر اسے دیکھا تھا۔

”یور آزا اگر دفاع کو ملزم کی ایلی بائی ثابت کرنی ہے تو ان کو وہ فہرست عدالت کے حوالے کرنی ہوگی۔“

”شیور“ میں تو تیار ہوں دینے کے لیے۔ اسی فہرست کے لیے تو آپ نے مجھے گرفتار کروایا ہے۔“ وہ پرتش مسکراہٹ کے ساتھ بولا

تھا۔ پراسیکیوٹر نے اب کے الجھ کر اسے دیکھا۔

”کون سی فہرست؟ آپ کو اس لیے گرفتار کیا گیا ہے کیونکہ آپ نے قمر الدین کا قتل کیا ہے۔“ جج صاحب چونک جانے کے انداز

میں باری باری کبھی فارس کو دیکھتے، کبھی پیچھے بیٹھے سابق پی جی کو۔

”کیا آپ ایک بھی ثبوت لا سکتے ہیں اپنے الزام کے حق میں؟“ وہ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ بے بسی بھرے غصے سے کہہ

رہی تھی۔

”فارس غازی بے گناہ ہے کیا اس کے چار سال ضائع کر کے لوگ خوش نہیں ہوئے جو اس کو ایک دفعہ پھر قید کی طرف دھکیلا جا رہا

ہے؟ وہ اپنا بیان دے چکا ہے۔ یہ case of two versions ہے۔ وہ اس رات قتل کی جگہ سے بہت دور تھا۔ ہمارے پاس 32 گواہ

ہیں۔ لیکن ان کے نام پراسیکیوٹن کے حوالے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم پبلک پراسیکیوٹن آفس کو سابق افسروں کے بارے میں انتقامی

کارروائیاں کرنے کا اختیار دے دیں۔“ پہلی دفعہ پراسیکیوٹر چونکا۔ مرکز تماشا یوں کی طرح بیٹھے سابق پی جی کو دیکھا جو سرخ چہرے کے

ساتھ بیٹھے تھے۔ لمحے بھر کے لیے پراسیکیوٹر کو اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔

”ایک منٹ مسز زمر.....“

”نہیں جناب عالی! اب وہ وقت آ گیا ہے جب ہم فارس غازی کو اکیلا چھوڑ دیں۔ اسے اس کی زندگی جینے دیں اور اس کے اوپر یہ

جھوٹے مقدمات ختم کریں۔“ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا اور آواز غصے سے پھٹ رہی تھی۔

”یور آزا“ مسز زمر کیس کا رخ دوسری طرف موڑ رہی ہیں۔ یہ غلط بات کہہ رہی ہیں۔“ پراسیکیوٹر پر اعتماد نہیں لگ رہا تھا۔ کبھی وہ پیچھے

بیٹھے پی جی کو دیکھتا، کبھی کٹہرے میں کھڑے فارس کو اور وہ دونوں پراسیکیوٹر سے بے نیاز ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ سپاٹ گہری نظروں

کے ساتھ۔

”مسز زمر واقعی غلط بات کہہ رہی ہیں۔“ جج صاحب نے برہمی سے پراسیکیوٹر کو مخاطب کیا۔ ”یہ دو versions کا کیس نہیں

ہے۔ یہ further inquiry کا کیس ہے۔“ (زمر نے بے اختیار میز پر دونوں بازو رکھے اور چہرہ ان پہ گرا دیا۔ اور فارس نے آنکھیں میچ کر

طویل سانس کھینچی۔) ”یہ ایک fishing expedition ہے۔ اور مجھے اس بنچ پہ بیٹھے شرم آ رہی ہے کہ پبلک پراسیکیوٹن آفس انتقامی

کارروائیوں کے لیے اس حد تک گر سکتا ہے۔“

”جناب عالی یہ چوینشن کو manipulate کر رہے ہیں۔“ پراسیکیوٹر بوکھلا کر احتجاج کرنے لگا مگر جج صاحب نے غصے سے

ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”سرکاری آفس نے اس کیس میں اپنی ذمہ داری درست طریقے سے انجام نہیں دی۔ آپ کے گواہوں کے بیانات میں جھول ہے۔ شواہد نا کافی ہیں۔ شریک جرم کریمزبل نہیں ہے۔ آپ نے ساڑھے تین ماہ سے ایک ایسے آدمی کو زیر حراست رکھا ہوا ہے جس کو مقید کرنے کے لیے آپ کے پاس نا کافی ثبوت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔“ وہ شدید برہمی سے کہہ رہے تھے اور پراسیکیوٹر لب کاٹا، سننے پہ مجبور تھا۔

”ان تیس لوگوں کو کورٹ میں گھینے کی میری نظر میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ عدالت فارس غازی کے بیان سے مطمئن ہے اور سیکشن 249 CrPc کے تحت فارس غازی کو نا کافی شواہد کے باعث با عزت بری کرنے کا حکم دیتی ہے۔ اور پبلک پراسیکیوشن آفس کو انتخاب کرتی ہے کہ اس قسم کے اچھے ہتھکنڈوں پہ اتر آنے سے گریز کریں تو یہ موجودہ پراسیکیوٹر جنرل کی صحت کے لیے بہتر ہوگا۔“ شدید غصے اور ناگواری سے کہہ کر جج صاحب نے اپنا ہتھوڑا زور سے میز پہ دے مارا۔ پیچھے بیٹھے سابق پی جی نے آنکھیں میچ کر گہری سانس لی اور پھر فارس کو دیکھ کر سر کو ذرا سا خم دیا اور اٹھ کر باہر چلے گئے۔ وہ اس کے احسان مند تھے۔

”اور آپ‘ فارس طہیر غازی....“ جج صاحب نے رخ اس کی طرف پھیرا۔ ”مجھے افسوس ہے اور شدید دکھ ہے کہ آپ کو فٹنگ ایکسیڈیشن کا شکار کر کے اتنے ماہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنے پڑے۔ میں پبلک پراسیکیوشن آفس کو ایڈوائس دوں گا کہ وہ آپ کو معذرت پیش کریں۔“

فارس نے کٹہرے کی ریٹنگ پہ ہاتھ رکھے، اٹھی گردن اور زخمی آنکھوں کے ساتھ بس اتنا کہا۔ ”آپ کا شکریہ یور آئر، لیکن ان کی معافی میری زندگی کے سوا چار سال نہیں لوٹا سکتی۔ میرے خاندان اور دوستوں میں ہوئی میری بے عزتی اور توہین نہیں ٹھیک کر سکتی۔ میری دودفعہ کھوجانے والی نوکریاں عزت سے مجھے واپس نہیں مل سکتیں۔ جب آپ کسی بے گناہ آدمی کو قید میں ڈالتے ہیں تو آپ اس کو معصوم نہیں رہنے دیتے۔ وہ اپنے دفاع کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کوئی خدا ہے بھی یا نہیں، کوئی قیامت آئے گی بھی یا نہیں، مگر مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ بے گناہ آدمی اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو روکنے کے لیے جو بھی کرے وہ قانوناً اور شرعاً درست ہوتا ہے۔“ بھینچے ہوئے ابرو کے ساتھ وہ نیچے اتر آیا۔

زمر اس وقت ڈھیر سا رونا چاہتی تھی، مگر وہ یہاں رو بھی نہیں سکتی تھی۔ بدقت سارے آنسو اندارتا کر اس نے چہرہ اٹھایا اور نگاہیں جھکائے بال کان کے پیچھے اڑتے اپنے کاغذ ترتیب سے رکھے لگی۔ وہ خاموشی سے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔

پراسیکیوٹر اب جج صاحب سے بات کر رہا تھا۔ صفائیاں، معذرتیں۔ زمر نے نگاہیں جھکائے کاغذ پہ لکھا۔ ”تم اس رات ہسپتال بھی گئے تھے یا نہیں؟“

فارس نے قلم اٹھا کر اس کے نیچے لکھا۔ ”صرف پچیس منٹ کے لئے گیا تھا۔ آپ کا کیا خیال ہے، میں اتنی گرمی میں پوری رات اسی جگہ بیٹھا رہا تھا؟“

”تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ اس رات تم کہیں اور تھے؟“

”آپ نے پوچھا ہی نہیں۔“ سادگی سے لکھ کر کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا۔

زمر کے تیوری چڑھ گئی۔ کاغذ پہ چند ہند سے لکھ کر اس کے سامنے ڈالا۔

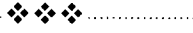
”یہ میری بقایا فیس ہے۔ وقت پہ ادا کرنا۔“ خفگی سے سرگوشی کی تو فارس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”مجھے ریسوکر نے نہیں آؤ گی؟“

”ٹیکسی کر کے آ جانا۔“ وہ رخ موڑے سنجیدگی سے جج صاحب کی طرف متوجہ تھی۔

”اور ٹیکسی کا کرایہ؟“

”اپنی گرل فرینڈ سے مانگ لینا۔“ وہ اٹھ کر آگے چلی گئی، اور وہ تکان بھری مسکراہٹ سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر گردن موڑی تو احمر ابھی تک ششدر بیٹھا تھا۔ اس کو متوجہ پا کر آگے ہوا۔ ”تو اس رات تم ایسی جگہ تھے جس کے بارے میں کوئی گواہی دینے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ واؤ۔ ایسے طریقے مجھے کیوں نہیں سوجھتے؟“ وہ محظوظ ہوا تھا۔ فارس پیچھے کو جھکا اور دھیرے سے کہنے لگا۔ ”تم نے میرے کیس کے لئے تمام انویسٹی گیشن کی۔ اس کے لئے تمہارا....“

”اس کی فیس اس پہ لکھی ہے۔“ احمر نے فوراً سے کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ ”پلس کچھوں کے پیسے الگ ہیں۔ ٹیکس الگ ہے۔ ویک اینڈ سے پہلے ادا کر دینا۔“ اور وہ جوشمکریہ ادا کرنے لگا تھا، رک کر اس کاغذ کو پڑھنے لگا۔ ابرو بے اختیار اٹھے۔ باری باری فیس کے دونوں تحریری مطالبوں کو دیکھا اور پھر ماتھے پہ پل لئے، ”بہت بہتر“ کہہ کر خفگی سے رخ موڑ لیا۔



یا اتنا سخت جان کہ تلوار بے اثر یا اتنا نرم دل کہ رگ گل سے کٹ گیا جس دو پہر فارس گھر واپس آیا، وہ انیکسی والوں کے لئے عید کا دن تھا۔ حسینہ اور صداقت نے اچھا سا کھانا بنایا تھا۔ سیم ندرت اور بڑے ابا اس کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ سب خوش باش اس سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ بھی مسکرا کر ان کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ وہ تھکا ہوا مگر مطمئن لگتا تھا۔

حنین مل کر اسٹڈی میں چلی گئی تھی۔ وہ کچھ کام کر رہی تھی۔ ایسے میں صرف زمر تھی جواب تک اس سے نہیں ملی تھی۔ اوپر اپنے کمرے میں وہ ناخن دانتوں میں دبائے ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ بار بار دروازے کی طرف بڑھتی، پھر سر جھٹک کر واپس ہولیتی۔ ذرا سی درز سے نیچے سے آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ (سب کو شکریہ کہہ رہا ہے۔ آپ آپ کا شکریہ، کھانے بھیجے گا۔ انکل آپ کا شکریہ، دعا کرنے کا۔ صداقت تمہارا شکریہ، پتہ نہیں کس چیز کا۔ اور میں جواتنے مہینے اس کے لیے خوار ہوتی رہی، میرا کوئی احساس نہیں!) وہ خفگی سے خود سے بڑبڑا رہی تھی۔ ”میں زمر کو دیکھ لوں۔“ وہ ایکسکیوز کر کے اٹھ آیا تھا۔ اب زینے چڑھنے کی آواز آرہی تھی۔ زمر نے جلدی سے نکیوں کے غلاف اتارے، نئے غلاف نکالے اور جس وقت وہ دروازہ ذرا سا بجا کر اندر داخل ہوا، وہ مصروف سی تکیوں کے غلاف بدلتی نظر آرہی تھی۔ ”السلام علیکم۔“ دروازے میں کھڑے وہ ذرا سا کھنکھار کر بولا۔ زمر نے ایک بے نیاز اچھتی نظر اس پہ ڈالی (جینز پہ سوئیٹر پہنے، وہ تھکا ہوا مگر مطمئن لگ رہا تھا) اور تکیے کو نئے کور میں ڈالتی ہوئے مصروف انداز میں بولی۔

”نمبر ایک۔ میں نے تمہارے لئے جو بھی کیا، ٹیم پارٹنر سمجھ کر کیا۔ نمبر دو، میں اب بھی نہیں بھولی کہ تم نے مجھے استعمال کر کے جیل توڑ نی چاہی تھی۔ نمبر تین، مجھے تمہاری ریسٹورانٹ والی باتیں بھی یاد ہیں۔ نمبر چار، تم جب چاہو ڈائیورس پیپر ز بنالو، اگر میرے پاس حق طلاق ہوتا تو میں خود بنالیتی۔ نمبر پانچ، میں مزید تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ اس لئے میں نے اپنا سامان نیچے اسٹڈی روم میں شفٹ کر دیا ہے۔ یہ کمرہ اب صرف تمہارا ہے۔ نمبر چھ، ہم ٹیم کی طرح..... پہلے کی طرح کام کرتے رہیں گے، لیکن تمہاری بے گناہی معلوم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے تمہیں معاف بھی کر دیا ہے۔ نمبر سات....“ الفاظ ٹوٹ گئے، کیونکہ وہ خاموشی سے قدم قدم چلتا اس کے پیچھے آکھڑا ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے اپنے کندھے سے لگایا اور تھوڑی اس کے کندھے پر جمائے، آنکھیں بند کیے اس نے صرف اتنا کہا۔ ”شکریہ۔ میرے لئے لڑنے کا۔“

چند ساعتیں اور گزریں۔ چند لمبے اور سرکے۔ زمر جو بالکل منجمد ہو گئی تھی، بمشکل گہری سانس لے کر بولی۔

”نمبر سات“ میں کل تمہارے خلاف restraining order فائل کروں گی۔ جس کے تحت تمہیں مجھ سے دس فٹ دور رہنا ہوگا۔“ اور اپنے ہاتھ چھڑائے۔ فارس نے چہرہ اٹھایا، اسے کہنی سے تھامے اپنے سامنے کیا، اور قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”تم کل یہ آرڈر فائل کرو گی؟ واقعی؟“

”بالکل!“ گردن کڑا کر بولی، مگر اس کی آنکھوں میں دیکھنا... اُف۔

”مگر کل تو چھٹی ہے۔“

”میرا مطلب تھا پرسوں۔“ تلملا کر بولی، اور کہنی چھڑا کر دروازے کی بڑھ گئی۔

”اچھا“ کمرہ مت چھوڑو ہم بیٹھ کر اس بارے میں بات کر لیتے ہیں۔“ وہ پیچھے سے بولا تھا۔ مکان سے مسکرا کر۔

”نمبر آٹھ“ میرا فیصلہ حتمی ہے۔“ بظاہر خشک لہجے میں کہہ کر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ سیڑھیاں اترتے اس کے کانوں سے دھوئیں نکل رہے تھے۔ بمشکل چہرے کو نارمل رکھے وہ اسٹڈی میں آئی تو اندر نقشہ بدلا ہوا تھا۔

ایک صوفہ کم بیڈ، جو فی الحال کھلا ہوا تھا۔ (اور اس کی اونچائی دو میٹرس جتنی ہی تھی) پر حنین لیپ ٹاپ لیے بیٹھی تھی۔ اندر سفید فلیش لگی تھی، اور حنہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا بنا؟“ زمر فوراً اس کے قریب آئی۔

”میں نے اس فلیش ڈرائیو کے پروگرام کو ڈی کرپٹ کر لیا ہے۔ اور وہ کھل گئی ہے۔“

زمر کو آگے پیچھے کی ہر شے بھول گئی۔ دل و دماغ میں جیسے سکون سا اتر آیا۔

”اوہ ریلی۔“ وہ خوشی سے کہتی اس کے ساتھ آکر بیٹھی اور اسکرین کو دیکھا۔

”کیا نکلا اس میں سے؟“

حنین ابھی تک شل تھی۔ ”میں نے اتنے مہینے لگائے، اتنا وقت برباد کیا، صرف ایلسا اور آنا کے لئے۔“

”کیا؟“

حنین نے اسکرین کا رخ اس کی طرف پھیرا۔ ”اس فلیش ڈرائیو میں سوائے فروزن فلم کے کچھ بھی نہیں ہے۔ ہر طرح سے کنگھال

چکی ہوں اسے۔ مگر یہ خالی ہے۔ یا تو بھائی نے اصل فلیش مجھے نہیں دی یا اس نے غلط فولڈر کا پی کیا تھا۔“ وہ ابھی تک سُن تھی۔

”اوہ نہیں!“ زمر نے نڈھال سی ہو کر سر پیچھے کو گرا لیا۔

اور قصر کا ردار کے لاؤنچ میں جواہرات کا ردار غصے سے ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ اس کی رنگت مارے غضب کے سیاہ پڑ رہی تھی، جبکہ

صوفے پہ بیٹھا ہاشم گردن پیچھے کو پھینکتا ہنستا جا رہا تھا۔ جواہرات نے رک کر ناچنڈیدگی سے اسے دیکھا۔ ”وہ رہا ہو کر ہمارے سروں پہ پھر سے

پہنچ گیا ہے اور تم ہنس رہے ہو۔“

”اس نے ڈینس اسٹینڈ پہ کھڑے ہو کر، ایڈوکیٹ جنرل کو بلیک میل کیا.... ہا ہا ہا.... ناؤ ڈیس کول۔“ وہ ہنس رہا تھا۔

”زمر کو تو میں دیکھ لوں گی، تم مجھے بتاؤ اب ہم اس کو دوبارہ کیسے جیل بھیجیں۔“

”اب پبلک پرائیویٹیشن آفس میں کوئی اس کو پرائیویٹ نہیں کرنا چاہے گا۔ میں نے آپ سے کہا تھا، کیس جلدی چلوانے کی کوشش

نہ کریں، لیکن خبر۔“ ہنستے ہنستے وہ بل بھر کر کا اور محظوظ انداز میں جواہرات کو دیکھا۔ ”میں مزید اس کو جیل میں نہیں بھیجنا چاہتا۔ اس کو صرف ایک

شخص اندر کر دیا سکتا تھا۔ کرٹل خاور۔ اب مزید کوشش نہ کیجئے۔ وہ ہمارے لئے خطرہ نہیں ہے۔ نہ بن سکتا ہے۔ اب مود آن کرنے کا وقت ہے۔

اچھے کام کرنے کا وقت ہے۔“ کوٹ کا بٹن بند کرتا اٹھا۔ ”میں مئی ایک اچھا انسان بننا چاہتا ہوں۔ میں راستہ تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے پرانی دشمنیاں چھوڑ کر آگے بڑھیے۔“ ماں کا شانہ تھپک کر وہ آگے بڑھ گیا۔ جواہرات وہیں کھڑی کستری رہی۔ پھر کمرے میں آئی۔ دروازہ مقفل کیا اور فون ملایا۔

”مجھے اچھی خبر کب سناؤ گے فصیح؟“ زہر خند لہجے میں وہ بولی تھی۔

”آج رات کام ہو جائے گا۔ پہلے سعدی اور پھر خاور۔“ سن کر اس نے موبائل پرے ڈالا اور سنگھار میز کے قد آور آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ سفید اور سرخ لہجے کا ڈون میں ملبوس وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی، مگر چہرے پہ چھایا غیض و غضب اس کے حسن کو گھنا رہا تھا۔ شرارے پھوٹی آنکھوں سے آئینے کو دیکھتے اس نے گردن میں پہنی موتیوں کی مالا نونچ ڈالی۔ تڑتڑتڑ..... سفید چکنے چکنے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر فرش پہ گرنے لگے۔

اوپر اپنے کمرے میں بستر پہ سستی سے نیم دراز پیروں کی قبچھی بنائے نوشیرواں کھنا کھٹ موبائل پہ ٹائپ کیے جا رہا تھا۔ بال بنے تھے اور لباس سے لگتا تھا کہ ابھی آفس سے لوٹا ہے۔ آنکھوں میں ازلی بے زاری کی جگہ مصروف سا تاثر تھا۔ گویا گفتگو میں بہت منہمک ہو۔

”بھائی شادی کرنے جا رہا ہے۔“ اسکرین پہ الفاظ ابھر رہے تھے۔ دوسری طرف سے علیشا کا جواب چمکا۔ ”یہی بتانے کے لئے اتنی صبح ٹیکسٹ کر رہے ہو؟“

”کیا تمہیں ذرا بھی دلچسپی نہیں سننے میں کہ وہ کس سے شادی کرنے جا رہا ہے؟“

”تم بتا دو۔“

”آبدار عید سے، وہ ہماری یونی میں تھی۔ مجھے شدید ناپسند ہے وہ۔ بھائی کو وہی لوگ پسند آئے ہیں جو مجھے شدید ناپسند ہوتے ہیں۔“ لکھتے ہوئے ابرو جھنجھ گئے اور آنکھوں میں خفگی عود آئی۔

”اچھا۔ وہی جس کو تم یونی میں تنگ کرتے تھے اور پھر ہاشم نے تمہیں پٹوایا تھا؟“ وہ محظوظ ہوئی تھی۔ لمحے بھر کو نوشیرواں کا ردِ انجمن ہو گیا۔ جیسے سارا خون جم گیا ہو۔ ہڈیاں برف کی ہو گئی ہوں۔

”کون ہاشم؟ اور تمہیں کیسے پتہ؟“ اس کے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا تھا کہ آبی کے منگیتر کا نام بھی شاید ہاشم ہو۔

”کیا تمہارے بھائی نے تمہیں نہیں بتایا کہ میں نے اورنگزیب صاحب کا اکاؤنٹ اپنے پاس مر کر رکھا تھا۔ ان کی ساری ای میلز میں پڑھا کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے ہاشم نے ان کو میل کر کے بتایا تھا کہ تم ان کے دوست کی بیٹی کو تنگ کر رہے تھے اسی لئے اس نے اپنے کسی بندے کے ذریعے تمہیں پٹوایا تھا۔ شاید اس کو یہ بھی کہا تھا کہ وہ خود کو اس لڑکی کا شوہر یا منگیتر ظاہر کرے۔“ وہ رکی۔ ”کیا تمہیں نہیں معلوم تھا؟“

نوشیرواں کے چہرے کا رنگ یوں خنجر گیا جیسے سینے میں گھاؤ لگا کر کسی نے سارا خون نکال لیا ہو۔ بے جان ہوتے ہاتھوں سے اس نے موبائل فون وہیں لحاف پہ گرادیا اور سر اٹھا کر خالی خالی شل‘ ششدر نظروں سے سامنے دیکھا جہاں سنگھار میز کا آئینہ اس کا زرد چہرہ منعکس کر رہا تھا۔

اس کی ساری دنیا زمین بوس ہو گئی تھی۔



فیض سر پر جو ہر اک روز قیامت گزری ایک بھی روز مکافات نہ ہونے پائی

کمرٹل خاور اپنے کمرہ جہن میں زمین پہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ نگاہیں دور خلا میں جمی تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں گم دکھائی دیتا تھا۔

آنکھوں کے گرد گنگے زخم آپ منہ مل ہو چکے تھے اور صحت بھی بہتر تھی۔ ایسے میں دروازہ کھلنے کی آواز سے وہ چوٹکا۔ اور چہرہ اٹھایا۔
گارد کھانے کی نرے لایا اور پیچھے زمین پر رکھی۔ خاد کی نگاہیں اودھ کھلے دروازے کے پار گئیں۔ وہاں ایک اور گارد نظر آ رہا تھا۔
خاد کی آنکھیں پر سوچ انداز میں سکریں۔

”تمہاری اور اس کی توضیح دی گئی ہوتی ہے تم لوگ اس وقت کیا کر رہے ہو؟ اور رات والے گارد کہاں ہیں؟“ اس کا ہاتھ اٹھا۔
گارد نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ گہری خاموشی نظر اور مڑ گیا۔ خاد تیزی سے اٹھ کر اس کے پیچھے آیا۔

”مجھے سعدی یوسف کے کمرے میں جانا ہے ابھی اسی وقت۔“ وہ چونکا ہوا لگتا تھا۔ مگر گارد نے ایک دم پیچھے مڑ کر ایک زوردار مکا خاد کے جڑے پر دے مارا۔ حملہ غیر متوقع تھا۔ وہ تپو راکر پیچھے کو گرا۔ اسی اثنا میں وہ دروازہ آگے سے بند کر چکا تھا۔ خاد وحشیانہ انداز میں دروازہ پٹنے لگا۔

”اگر تم نے اسے مارا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ تم اس کو نہیں مار سکتے۔ اس کو ابھی نہیں مرنے دے۔“
سعدی یوسف کے کمرے تک یہ آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ اسڈی ٹیبل پر بیٹھا کاندھا سامنے رکھے سنہری قلم سے لکھتا رہا تھا۔

میں بناؤ مانگتا ہوں اللہ کی دھمکے ہوئے شیطان سے۔
سیاہی شرت میں ملبوس اس لڑکے کے ہاتھ شیمو کیے بال کیلے اور سیلتے سے پیچھے کو بٹے تھے۔ وہ گردن ترجمی کیے ’منہبک سا قلم کاٹا‘
پر گڑ رہا تھا۔

”قرآن میں بہت سے واقعات آپ پھیر پھیر کر لاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بدلاتے ہیں۔ ہر دفعہ ہرانے کا مقصد مختلف ہوتا ہے۔
جیسے سورۃ النمل میں جتنے بھی واقعات ہیں ان میں ایک قدر مشترک ہے۔ ویسے تو بہت سی اقدار مشترک ہوں گی مگر میں محدود سوچ اور محدود علم کا آدمی ہوں۔ اتنا غور و فکر کر پاؤں گا جتنی میری ذہنی وسعت ہے۔ سو میں کہہ رہا تھا اللہ کہ اب تک جتنے واقعات پر غور و فکر کیا ہے میں نے ان سب میں ایک اکائی ہے جو پورے سنہم کے خلاف کمزری ہے۔ پہلے موسیٰ کا واقعہ۔ ایک موسیٰ اور سامنے فرعون اور اس کے لاء لشکر۔ پھر سلیمان اور ان کے سامنے ایک پورا سنہم جس کو وہ کنٹرول کیے ہوئے ہیں۔ پھر ایک سلیمان اور ان کے سامنے ملکہ سبا اور اس کے سردار و سلطنت۔
... دوسری جانب ایک ملکہ سبا اور سامنے سلیمان اور ان کے لاء لشکر۔ ایک چہ جو پورے لشکر کے سامنے اکیلا کھڑا اپنی صفائی دے رہا ہے۔ پھر ایک شعیب اور ان کے سامنے یوری کافر قوم۔ لیکن اگر غور کرو تو سورۃ کا نام ’النمل‘ ہے۔ جیو خیال۔ کوئی بھی یہاں اکیلا ہو کر بھی اکیلا نہیں ہے۔ موسیٰ کے ساتھ ان کے بھائی اور ان کی قوم ہے۔ سلیمان کے ساتھ ان کے لوگ ہیں۔ ملکہ بھی اپنے سرداروں کے ساتھ ہے۔ شعیب بھی اپنی قوم کی اہلیت سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے بھی ’وارث‘ تھے جن سے ان کے خلاف قتل کی سازش کرنے والے ڈرتے تھے۔ انسان کو بڑے بڑے کام کرتے وقت یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ مجھ اکیسے نے یہ سب کر لیا۔ میں اکیلا ایک سیلف میڈ آدمی ہوں۔ بلکہ نہیں۔ بہت سے لوگ۔ خاموش جوتیوں جیسے لوگ ہوں گے جنہوں نے آپ کا ساتھ دیا ہو گا۔ ان کو بھولنا نہیں چاہیے۔ جو بندوں کا شکر نہیں کرتا وہ رب کا شکر نہیں کرتا۔“

باہر کچن میں وہی گارد خاموشی سے نرے میں پلٹ رہا تھا۔ چنچ کا مناسب برابر کیا۔ ٹیکسین سجایا۔ گلاس رکھا۔
”اور نجات دی ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جو (اللہ سے) ڈرتے رہے۔ اور لوگو کو جب اس نے فرمایا اپنی قوم سے ’کیا تم اس کتاب کرتے ہو‘ فاحش‘ (بے حیائی) کا حال انکے تم دیکھتے ہو“

”فاحش!“ تیز تیز لکھتے اس معصوم لڑکے نے گہری سانس لی۔ ”اس لفظ کے ساتھ ذہن میں عموماً ان کاموں کا خیال آتا ہے جو

ہنگامی سے جڑ سے ہوتے ہیں۔ اور قحط ہوئے ہی ہیں مگر اس قحط کا مطلب زیادہ وسیع ہے۔ قحط ہوا اس کو کہہ سکتے ہیں جو مکمل کھام کھام کیا جائے۔ چاہے وہ ہنگامی ہو مکمل قوم کو لوٹا ہوا سو سچی بات سے شادی ہو یا نہ ہاں ہے۔ ہونے والی کچھ اور سبیل رتی کی جاسکتی ہیں۔ قوم کو لوٹا سرفروں کو لوٹا سکتے تھے اور ان کا نقش عمل اس کے علاوہ ہے۔ لوٹا ہوا کو کہتے ہیں کہ ”تھروان“ (تم لوٹ گئے ہو، یہاں) ”نظر“ نہیں آئی، نظر یعنی آنکھ سے دیکھا۔ یہاں ”نظر“ کہا گیا ہے۔ سہر میں دلی سے دیکھتے، سمجھتے دیکھتے، گھر دیکھتے، قحط کھانا، رائجوں کو کھانے والے لوگ جو ہر گھائی کی ہی حالت نہ کریں، ابھی قوم کو لوٹا چھٹی ہوئے۔ آج کل کھلم کھلا کہہ کر نے کو بولتے ہیں کہا جاتا ہے۔ خود اصرار کیا جاتا ہے۔ کھانے والے بچے بڑوں کے ساتھ بد نظری سے بات کر رہے ہوں کھلم کھلا ہے ابلی ہو رہی ہوں اب باپ خوش ہو رہے ہوتے ہیں کہ بچہ کاغذ بند ہے کہو ہے۔“

بچہ میں میری اب بیانیے میں سوچا ابلی رہی تھی۔ گھبراہٹ پر ماکڑا تھا۔

”کیا لوٹا نے کیا تم آتے ہو بڑوں کے پاس شہوت کے لئے، لورڈز کو بھڑک۔ بلکہ تم ایک قوم ہو جو جہالت رہتے ہو۔“
”گراٹھ ہوئی۔“ وہ اپنی سحرکات کے ساتھ کھٹکھٹا جا رہا تھا۔ ”آج کل یہ کھانا عام ہو گیا ہے کہ اب ہمارے بچے اس کو کھتے ہات لپٹے لگے ہیں۔ تو انہیں بات کرنا کہ اب لوٹا ہو، بیکل اور بات بیان کر کے یہ بات لوگوں کے ذہنوں میں ڈھکی چھپی ہے کہ بیکو لوٹا اپنے ہی ہوتے ہیں۔ سون کو برداشت کریں، نہ کر لیں۔ تو بیکو لوٹا نے برداشت کیوں نہیں کی؟؟ کائنات میں کسی نے یہ کھانا پہلے نہیں کیا تھا۔ یہ اسی قوم سے شروع ہوا تھا۔ آج لوگ اس کو برداشت نہ کر سکتے ہیں ابلی اور ترقی پسندی کی علامت قرار دیتے ہیں۔ ہمارے والد لوٹا نے اس کو جہالت قرار دیا تھا۔“

اس میں میری نے گرم گرم چالوں کی پلٹ دیکھی ساتھ میں بچن کر رہی۔ پانی ٹھوس میں اتر رہا۔ اور اسے اٹھانے لگی تو کارا آگے بڑھا۔

”تمہارے کھانا میں گار۔ پس کارہار کا علم ہے۔“

میری کی آنکھوں میں قہقہہ اُٹھ آیا۔ ”نکر۔۔۔“

”خاسوٹی ہو۔“ اسے گھور کر اسے اٹھالی اور آگے بڑھا گیا۔ میری آنکھوں کی کڑی رو لگی۔

”تو نہ تو جواب اس کی تو مہکا نکر پر کڑکال و آل لوٹا کا پتی پتی سے بے شک یہ وہ لوگ ہیں جو بہت پاک بچتے ہیں۔“

”دلچسپ بات یہ ہے اٹھ کر آئی تھی“ اس میں سینہ پا اس کا ٹھوڑے تھیں مڑنے کے لوگ بولتے ہیں۔ ایک اس کو کھانا فرما دیتے ہیں۔ اور اس کے حق میں ”نغری“ اور پر عمل چاہیں“ ہونے کی روایت کرتے ہیں۔ اور تیسرے۔ تیسرے لوگ اس عمل کے خلاف ہیں اور کھانا کھاتے ہیں۔ کچھ جڑا ہوئے لوگ کہتے ہیں کہ اسے خود فرما دیتے ہیں؟ چاروں میں سے آگے اسلام کا پتہ ہے ان کو؟ یہ خود کا کھانا پڑا سا کھانے کا پتہ کرتے ہیں؟ پہلے لوگوں کو گھر گھر چھت کر دینا خود فرما۔ یہ تیسرے لوگ بھاری بھاری کھانے کے نام میں عمل کے کرنے والوں سے خلاف ہیں کرتے مگر یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے اور خود فرما یہ لوگ اپنی قوم کو فرما دیتے ہیں۔ اگر ہائی کی بات نہیں مائی تو اس پر عمل نہ لگے کہ وہ ہر طریقہ کی بات نہیں ہے۔ ”بچہ نہیں ہے صحت کے لئے اور خود اسے کیا ہو؟“ غرور کہنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ قوم کو لوٹا کا طریقہ ہے۔ جانوں کا طریقہ۔ اور اصل صورت ہے۔ بھلیوں کی۔ علم اور اپنی کے خلاف کڑے ہونے والے لوگوں کی۔ جو نہ لڑا نہیں رہتے تھے۔“

”تو کھات دلی سے لے لوٹا لوگوں کے گھر والوں کا۔ سوائے اس کی جی کے۔ قصہ کہہ کر دیا م نے اس کو کچھ نہ جاننے والوں میں سے۔ اور یہ سائی سے لے ان پر دوش تہ بہت تہ جی یا دوش دے دے جانے والوں کی؟“

سعدی لکھ رہا تھا۔ کچن میں ہونے والی سرگرمی سے بے نیازی۔

”انسان اسی کے ساتھ ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ انجیل مقدس کے مطابق لوٹ کی بیوی نے لوٹ اور دو بیٹیوں کے ہمراہ نکلتے ہوئے..... پیچھے مڑ کر دیکھا تھا اور وہ نمک کا مجسمہ بن گئی۔ پھر آگئی۔ وہیں سے وہ ”پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا پتھر کے ہو جاؤ گے۔“ والی اصطلاح نکل ہے۔ جو گناہ آج لوگوں کو اتنا ہلکا لگتا ہے پر سئل چوائس لگتا ہے وہ اتنا سخت ناپسندیدہ ہے اللہ کے نزدیک کہ الہامی کتب میں آتا ہے..... جبرائیل نے اپنے پر پہ اس پوری بستی کو اٹھایا، آسمان تک لے کر گئے اور واپس پٹن دیا۔ وہ زمین میں دھنس گئے۔ ان پہ پتھروں کی ٹارگنڈ بارش برسی۔ ہر شخص کے اوپر وہ پتھر آ کر لگا جس پہ اس کا نام منقش تھا۔ آج اس جگہ پہ بحر مردار (dead sea) ہے۔ جہاں کوئی ذی روح نہیں رہ سکتا۔ جہاں پانی کے اندر... اتنے برسوں بعد بھی کوئی زندگی نہیں ہے۔ نہ زندگی پل سکتی ہے۔ یہ اتنے بڑے گناہ تھے اور آج لوگ....“ قلم خشک ہونے لگا۔ اس نے رک کر قلم چھڑکا۔ پھر لکھا۔ بے سود۔ اس کا موڈ خراب ہونے لگا۔ لکھنے کے لئے سب سے ضروری چیز ایک اچھا قلم ہوتی ہے۔ سعدی نے خشکی سے اس کے اوپر کے کلپ دیکھے۔ وہاں چار بٹن تھے۔ اس نے موجودہ بٹن کا بٹن واپس اوپر کر دیا۔ اور دوسرا گرایا۔ لکھا تو وہ سرخ لکھتا تھا۔ اونہوں۔ اس نے تیسرا بٹن دبا کر تیزی سے بٹن نکالی۔ وہ نیلی تھی۔ اور سعدی کو صرف سیاہ روشنائی پسند تھی۔ اس نے چوتھے بٹن کو نیچے کیا تو اندر سے... باریک سی بٹن نکلی۔ وہ اس سے لکھنے لگا پھر غور سے دیکھا۔ وہ بٹن نہیں تھی۔ سوئی کی طرح تھی۔ تیز دھار آلے کی طرح۔ اس کو اب دبار کی آنکھوں کا اشارہ یاد آیا۔ وہ رک کر سوچنے لگا۔ تبھی دروازہ کھلا تو اس نے جھٹ قلم مٹھی میں دبایا اور یوں ظاہر کرنے لگا گویا اپنا لٹھا پڑھ رہا ہے۔

گارڈ نے دروازہ بند کیا۔ ٹرے لا کر رکھی۔ باری باری چیزیں نکال کر میز پہ سجائیں۔ پھر... سعدی کی طرف پشت کیے..... جب سے زنجیر کا کلز نکالا۔ وہ خاور کو باندھی گئی زنجیروں سے مشابہت رکھتی تھی۔ اس پہ خاور کا خون اور ڈی این اے موجود تھا، اور گارڈ کے ہاتھوں پہ دستانے چڑھے تھے۔ شفاف باریک دستانے۔

وہ ایک دم پلٹا اور پیچھے سے آ کر سعدی کی گردن میں وہ زنجیر ڈالی۔ بلکہ ڈالنی چاہی۔ مگر سعدی تیزی سے آگے کو جھکا، اور خود کو کرن سمیت دائیں جانب گرایا۔ گارڈ کے ہاتھ میں اس کی شرٹ کا پچھلا حصہ آیا تھا، وہ اس سے اس کو کھینچتے ہوئے زمین پہ گرانے لگا۔ سعدی نے ”میری... کوئی ہے....“ چلاتے ہوئے ہاتھوں اور پیروں سے اس کو پرے دھکیلنا چاہا، مگر گارڈ کا زور بہت زیادہ تھا۔ وہ گھٹنا سعدی کے سینے پہ رکھے، پوری قوت سے اسے نیچے گرائے رکھے، زنجیر اس کی گردن میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا اور سعدی مسلسل سر دائیں بائیں ہلاتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پوری قوت لگاتے ہوئے گارڈ کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔ سعدی نے بھی اتنی ہی قوت سے اس کے ہاتھوں کو پلڑ کر پرے ہٹایا اور اس سے پہلے کہ اٹھتا، گارڈ نے زور کا مکا اس کے جڑے پہ رسید کیا۔

سعدی کا داغ بھی گھوم گیا اور چہرہ بھی۔ اور جب چہرہ بائیں جانب گھوما تو اسے دھندلا سا نظر آیا۔ سنہری پن ساتھ میں گرا پڑا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا.... پھیلا یا.... قلم چنداں چور تھا۔ گارڈ نے اس کی گردن کے گرد زنجیر لپیٹی اور اسے کسے لگا.... سعدی کی انگلیوں نے قلم کو تھما اور اگلے ہی لمحے اس نے قلم اٹھا کر گارڈ کے جسم کے اندر اتار دیا۔ دھندلی بصارت کے باعث سمجھ نہیں آئی کہ کدھر مارا.... مگر.... منظر ذرا واضح ہوا.... گردن کی زنجیر ڈھیلی ہوئی تو دیکھا.... پن گارڈ کے ہاتھ کی پشت میں کھب چکا تھا۔ زنجیر گارڈ کے ہاتھوں سے پھسل گئی اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اگلے ہی لمحے گھٹنوں کے بل زمین پہ گرا۔ سعدی نے زنجیر گردن سے نکالتے... لڑکھڑا کر کھڑے ہوتے اسے دیکھا۔

گھٹنوں کے بل بیٹھا گارڈ.... سعدی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی رنگت سفید پڑ رہی تھی اور آنکھوں میں ایک شل سا تاثر تھا۔ منہ سے یہ ایک جھاگ نکلنے لگی اور وہ منہ کے بل نیچے گرا۔

سعدی ایک لمحے کے لئے تو منجمد ہو گیا، پھر تیزی سے اس کے اوپر جھکا۔

”Don't die“ جلدی سے اسے سیدھا کیا اور اس کا چہرہ تپتہ چھایا۔ گارڈ ابھی تک سعدی کو دیکھ رہا تھا۔

”مرنا مت پلیز مت مرنا۔“ وہ وحشت سے اس کو جھنجھوڑتے کہہ رہا تھا۔ گارڈ کی متعجب آنکھیں سعدی پہ جمی تھیں۔ وہ اتنی حیران اتنی ششدر آنکھیں تھیں.... کہ سعدی کا دل بند ہونے لگا۔ اور ان آنکھوں میں روشنی بھی تھی۔ زندگی کی رمت۔ اور پھر.... سعدی نے دیکھا.... لمحوں میں روشنی کی وہ جوت بجھ گئی۔ گارڈ کا جسم ٹھنڈا نیلا پڑ گیا۔ بے جان بالکل سرد۔

یہ وہ پہلا قتل تھا جو سعدی یوسف نے کیا تھا۔

اور یہ وہ پہلی رات تھی جب سعدی یوسف نے سعدی یوسف کو کھودیا تھا۔

(اختتام حصہ دوم)



باب 20:

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے

(حصہ سوم)

”ماہِ کامل کی وہ برف رات!“

کوہسار پہ سفید برف دمک رہی ہے۔

ایک قدم کا نشان تک نہیں ہے۔

ایک تنہائی کی سلطنت ہے...

اور یوں لگتا ہے جیسے میں ملکہ ہوں!

میرے اندر کے طوفان کی طرح باہر کی ہوا بھی غرار ہی ہے

میں اپنے شر کو اندر نہیں دبا سکی...

خدا جانتا ہے میں نے کتنی کوشش کی!

کہ ان کو معلوم نہ ہونے دوں!

وہ اچھی لڑکی بن جاؤں جو مجھے بننا تھا۔

چھپالوں، محسوس نہ کروں ان کو پتہ نہ چل جائے۔

مگر خیر... اب جان گئے سب!

سو... جانے دو... جانے دو

اب نہیں دبا سکتی اس کو اندر

جانے دو... جانے دو

مڑ جاؤ... اور دروازہ پٹخ دو

لوگ کیا کہیں گے، مجھے پرواہ نہیں۔

طوفان کو برپا ہونے دو۔

ٹھنڈ سے مجھے فرق پڑا کبھی نہیں!

عجیب بات ہے کہ کیسے ذرا سے فاصلے سے

چیزیں چھوٹی دکھائی دینے لگتی ہیں۔

اور وہ خوف جو کبھی مجھے گھیرے رہتا تھا

اب مجھے چھو بھی نہیں پارہا۔

اب یہ دیکھنے کا وقت ہے کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔

اب اپنی حدود کو آڑ مانا ہے اور توڑنا ہے

نہ کوئی صحیح، نہ کوئی غلط... کوئی اصول نہیں میرے لئے۔

میں ہوں آزاد!

جانے دو... جانے دو

تم اب مجھے کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھو گے

یہاں کھڑی ہوں میں اور یہیں رہوں گی میں!

طوفان کو برا ہونے دو۔

کسی برف شارق کی طرح ایک خیال دل میں جم سا جاتا ہے!

”میں کبھی واپس نہیں جاؤں گی، ماضی، ماضی میں رہ گیا۔“

جانے دو... جانے دو

اور میں اٹھوں گی تازہ صبح کی طرح

جانے دو... جانے دو

وہ پرفیکٹ گرل اب نہیں رہی...

اور یہاں کھڑی ہوں میں، دن کی روشنی میں

طوفان کو برا ہونے دو

ٹھنڈ سے مجھے فرق پڑا کبھی نہیں!

Elsa Queen (فروزن)

فصیح نے تیز قدموں سے راہداری عبور کی اور اضطراب پہ قابو پائے دروازہ کھولا تو گارڈز اور میری خاموش کھڑے نظر آ رہے تھے۔ سعدی کے کمرے کی چوکھٹ پہ خاور کھڑا فرش کو دیکھ رہا تھا جہاں بے سدھ گارڈ لیٹا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی نے بند نہیں کی تھیں۔ وہ ہنوز شاک کے عالم میں کھلی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی زمین پہ سعدی اکڑوں بیٹھا تھا۔ گھٹنے سینے سے لگائے وہ شل سا سامنے خلاء میں دیکھ رہا تھا۔ مٹھی سختی سے بند تھی۔

”کیا ہوا ہے ادھر؟“ فصیح خود پہ غصہ طاری کرتا، گارڈز کو ہٹاتا تیزی سے اندر داخل ہوا۔ لاش کے قریب جوتے روکے۔

”وہ کھانا لے کر اندر گیا۔ پھر کچھ دیر بعد سعدی نے آواز دی۔ میں آئی تو یہ دونوں اسی حالت میں تھے۔ یہ کچھ بتا نہیں رہا تھا تو میں

نے خاور کو بلایا۔“ میری جلدی جلدی کہنے لگی۔ گارڈز بھی دم بخود تھے۔ مرنا یا مارنا، ان کی جاب ڈسکرپشن میں شامل نہ تھا۔ وہاں کسی کو بھی معلوم

نہ تھا کہ ان کا ساتھی گارڈ سعدی یوسف کو قتل کرنے اندر گیا تھا۔ اور جس نے اسے بھیجا تھا، اب وہ بچوں کے بل لاش کے قریب بیٹھا۔

”اس کی موت زہر کی وجہ سے ہوئی ہے۔“ خاور نے خشک لہجے میں اسے مخاطب کیا، مگر فصیح نے جھک کر اس کی نبض چھوئی، گردن پہ

ہاتھ رکھا۔ پھر احتیاط سے ہاتھ کی پشت دیکھی۔ وہاں موجود نشان واضح تھا۔

”کہاں سے آیا زہر تمہارے پاس؟“ اس نے سعدی کو جھپٹ کر کھڑا کیا۔ سعدی ابھی تک اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پہ جمی تھیں۔ فصیح نے پہلے جبراً اس کی بند مٹھی کھولی۔ اندر مڑی تڑی تصویر تھی۔ پھر اس نے اس کی تلاشی لی، جیبیں پتھپتھائیں۔ ”پورا کرہ چپک کر ڈال ایک ایک چیز چھان مارو۔ زہر یلا انجکشن کہاں سے آیا؟ مجھے جواب چاہیے۔ اس کی بھی تلاشی لو۔“ خاور کی طرف اشارہ کرتے وہ گر جاتا تھا۔ خاور نے ابرو اچکا کر ہاتھ اٹھا دیے۔ گارڈز آندھی طوفان کی طرح کرہ کنگھالنے لگے۔ میری وہاں سے ہٹ آئی۔

قریباً ایک گھنٹہ گارڈز اس کے کمرے کو چھانٹتے رہے۔ ہر شے الٹا دی، کھرا دی، مگر زہر پلے سرخ نہ ملی۔ فصیح، جواہرات کو کال ملا تا وہاں سے نکل گیا۔ وہ سخت پریشان لگتا تھا۔ کمرے میں وہ دونوں تمہارہ گئے تو خاور نے ایک گہری نظر سعدی پہ ڈالی جو پھر سے فرش پہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ شل، ساکت۔ لاش اب وہاں نہیں تھی۔

”شکر کرو بروقت میری نے وہ بین چھپا دیا۔ ویسے کہاں سے آیا وہ تمہارے پاس؟“

وہ نہیں سن رہا تھا۔ بس ایک ٹک دیوار کو دیکھ رہا تھا۔

”وہ تم پہ حملہ کرنے آیا، تم نے اسے مار دیا۔ ٹھیک کیا۔ اب ہم زیادہ دن یہاں نہیں رکھیں گے۔ ماہِ کامل کی رات قریب پہنچی ہے۔“

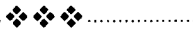
اس نے اب بھی کچھ نہیں کہا۔ خاور سر جھٹک کر باہر نکلنے لگا تو وہ بولا۔

”اس کی بھی فیملی تھی۔“ دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے مٹھی کھولی۔ ”یہ اس کی جیب میں تھی۔ اس کی بیوی کی تصویر۔ ساتھ میں ایک بچی بھی ہے۔ دو لوگ... دو لوگ تھے اس کی فیملی میں۔ میں نے جس کی جان لی وہ ایک باپ بھی تھا۔“

”وہ ایک قاتل تھا۔“ خاور ناگوار سے بولا۔

”وہ... ایک... انسان تھا...“ سعدی نے آنکھیں اس کی طرف موڑیں تو وہ سرخ تھیں، مگر خشک تھیں۔ ان میں اس وقت بہت سے جذبات تھے۔ دکھ، غصہ، گلت، بے بسی۔ اور ان میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔

”تو پھر مبارک ہو سعدی یوسف۔ آج سے تم بھی ہم جیسے قاتلوں میں شامل ہو گئے ہو۔“ خاور بگڑ کر کہتا باہر نکل گیا۔ سعدی نے زلّی نظروں سے اسے جاتے دیکھا تھا۔ اس کا دماغ ابھی تک شل تھا۔



میں ایسے جگمگے میں کھو گیا ہوں..... جہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے

صبح دھند میں ڈوبی تھی۔ کہیں کوئی سنہری کرن ذرا دیر کے لئے جھانکتی، پھر دھند لکڑوں میں گم ہو جاتی۔ زمر نے اسٹڈی روم (اپنے لئے کمرے) کا دروازہ کھولا تو لاؤنج میں معمول کی گہما گہمی نظر آئی۔ صداقت ابا کی وکیل چیئر باہر لا رہا تھا۔ حینہ انڈے پھینٹ رہی تھی۔ ندرت فرج کھولے کھڑی تھیں۔ سیم یونیفارم میں ملبوس ناشتے کے لئے دہائی دے رہا تھا۔ ایسے میں سب نے سیاہ کوٹ میں ملبوس تیار سی زمر کو اسٹڈی سے نکلنے دیکھا تھا۔ ندرت بالکل ٹھہر گئیں۔ (ابھی کل ہی تو فارس آیا تھا اور...؟)۔ ابا نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔

”تم... ادھر تھیں؟“ ندرت نے صداقت کے باہر جانے کا انتظار بمشکل کیا اور پھر پوچھے بنانہ رہ سکیں۔ وہ جو سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھی، مڑ کر بنا کسی تاثر کے ساتھ ندرت کو دیکھا۔ ”جی۔ مجھے دیر تک کیس اسٹڈی کرنا ہوتا ہے۔“ سادگی سے کہہ کر زینے چڑھنے لگی۔ اہا! بالخصوص نظر انداز کیا جو بالکل خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

زیعے عبور کرتے ہوئے اسے اپنی پشت پہ سب کی، حتیٰ کہ حینہ تک کی نظریں محسوس ہو رہی تھیں۔ ابھی وہ اوپر پہنچی ہی تھی کہ فارس (اور اس کے سابقہ) کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلا۔ جنیز پہ پوری آستین کا سفید سویٹر پہنے، وہ تازہ دم لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔
 ”السلام علیکم۔“ ایسے مسکرا کر بولا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔ (نگاہیں اب تک پشت پہ گڑی محسوس ہو رہی تھیں۔)
 ”وعلیکم السلام۔ میرے جانے کے بعد کتنے خوش لگ رہے ہو۔“

وہ ہلکا سا ہنسا اور نفی میں سر ہلایا۔ پھر اس کی تیاری دیکھ کر استفسار کیا۔ ”کورٹ جا رہی ہو؟ کیوں؟“
 ”تمہارے کیس کی وجہ سے جتنے لوگوں کے کیسز میں نے لٹکائے ہیں نا، ان کو بھی تو دیکھنا ہے اور ہاں۔ میری فیس نہیں ادا کی تم نے؟“

فارس نے گہری سانس لی۔ ”میری دوسری جاب بھی جا چکی ہے نئی ملتے ہی ادا کر دوں گا۔ کچھ دن کی مہلت دے دیجئے۔“ زمر نے بمشکل مسکراہٹ دہائی۔

”صرف کچھ دن!“ تنبیہ کی اور پھر حنہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ فارس نیچے اتر آیا۔ ندرت ان کو نارمل دیکھ کر واپس کاموں میں لگ گئیں مگر اب بالکل خاموشی سے کچھ سوچتے رہے۔

اس نے حنہ کے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ بیڈ پہ کبل لئے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اچھے بال، سوتی صورت، بالکل چپ سی ہوئی، گھٹنوں پہ بچے لیپ ٹاپ کو دیکھ رہی تھی۔ زمر بیڈ کے کنارے آ بیٹھی۔ ”سو ہماری اتنے مہینوں کی محنت ضائع ہو گئی۔ وہ فلیش بے کار ہے۔“
 ”ہوں۔“ وہ غیر معمولی چپ تھی۔

”ہمیں فارس کو بتادینا چاہیے۔ پچھلے تین چار ماہ فارس کی وجہ سے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے، مگر اب ہمیں سعدی کے لئے فوراً کچھ کرنا ہے۔ ہمیں وہ فلیش چاہیے ہے حنہ، کیا دیکھ رہی ہو؟“

”شیر وکا ان باکس۔ وہ رات علیشا سے بات کرتا رہا تھا۔ یاد ہے اس کو ایک دفعہ ایک لڑکی نے پٹوایا تھا۔ ہارون عبید کی بیٹی۔ آبدار عبید۔ مگر علیشا اسے بتا رہی ہے کہ اسے ہاشم نے پٹوایا تھا۔“ وہ سارا قصہ سنارہی تھی۔ پھر ان کی ہوئی نظریں اب بھی اسکرین پہ جمی تھیں۔
 زمر اس کے ساتھ آ بیٹھی اور غور سے ساری گفتگو پڑھنے لگی۔ (حنین نے شروع کا پورشن چھپا دیا تھا۔) اب زمر کو کیا بتائے؟

”کون ہے یہ آبدار عبید؟“

حنہ نے گولل کر کے نتیجہ اس کے سامنے رکھا۔ وہ کسی سیمینار میں اپنے والد کے ہمراہ کھڑی تھی۔ سرخ اسکارف لئے، گرے آنکھوں والی خوبصورت لڑکی جو سفید پینٹ اور بھورے کوٹ میں ملبوس تھی۔ کسی باہر کے ملک کی تصویر تھی۔

”یہ تو...“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ اب حنین کو کیا بتائے؟

نیچے آئی تو فارس، ندرت، اور اسامہ کچن میں گول میز کے گرد ناشتہ کر رہے تھے۔ سیم بولے جا رہا تھا اور فارس مسکرا کر سن رہا تھا۔ ایسے میں ابالاولیٰ کے دوسرے کنارے بیٹھے تھے۔ چپ بالکل چپ۔ زمر نے اپنا کپ لیا اور ان کے ساتھ آ بیٹھی۔

”ہم ٹھیک ہیں۔ آپ نے دیکھ تو لیا ہے۔“ قدرے بے نیازی سے شانے اچکا کر کپ لبوں سے لگایا۔

ابانے انہی سنجیدہ خاموش نظروں سے زمر کو دیکھا۔ ”میں نے دیکھا ہے۔ تم دونوں نارمل طریقے سے باتیں کر رہے تھے۔ میں تمہیں

بتاؤں اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے یہ سب پہلے دن سے چلا آ رہا ہے۔ اب تم لوگ عادی ہو چکے ہو۔“

ان کے لہجے میں کیا کیا نہیں تھا۔ چائے اس کو اندر تک تیزاب کی طرح جلا گئی۔ وہ بالکل سن رہی تھی۔ پھر بنا کچھ کہے باہر نکل گئی۔

اوپر اپنے بیڈ میں بیٹھی حنین اسی سطر کو بار بار پڑھ رہی تھی جو شیر و نے علیشا سے کہی تھی۔

بھائی شادی کر رہا ہے۔۔۔ بھائی شادی۔۔۔ بھائی۔۔۔
شیخ کی دوا! اپنی ٹیچر کی دعا۔۔۔ فجر کی قضا صلوٰۃ۔۔۔ سب اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ اس کی ساری دنیا برف ہو گئی تھی۔



میری کشتی کو بھلا موج ڈبو سکتی تھی؟..... میں اگر خود نہ شریک کف دریا ہوتا
قصر کاردار بھی اس صبح دھند میں ڈوبا تھا۔ اپنے کمرے میں سنگھار میز کے سامنے کھڑا ہاشم اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے ٹائی کی گرہ لگا رہا
تھا۔ چہرے پہ سنجیدگی تھی۔ گیلیے بال پیچھے کو برش کیے وہ اب بہتر لگتا تھا گویا پچھلے چند ماہ کی بے سکونی دھیرے دھیرے غنقا ہو رہی تھی۔ تبھی اس کا
فون بجا۔ اس نے سنگھار میز پر رکھے موبائل کا اسپیکر آن کیا اور کف لنکس اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں بولو فصیح۔“
”سر۔۔۔ رات میں آپ کا فون آف تھا، میں بتا نہیں سکا۔ سعدی نے ایک گارڈ کو قتل کر دیا ہے۔“
کف لنک کو کف پہنتی کرتی اس کی انگلیاں ٹھہر گئیں۔ لمحے بھر کے لئے وہ منجمد ہو گیا۔ ”قتل؟“
”گارڈ اس کے کمرے میں گیا، اور کچھ دیر بعد اس کی وہاں سے لاش ملی۔ زہر کے انجیکشن سے مارا گیا ہے اسے۔“
”کیسا انجیکشن؟“ وہ چونکا۔

”ہم نے بہت ڈھونڈا مگر انجیکشن نہیں ملا۔ اس کے پاس سے کچھ بھی نہیں ملا۔“
”فصیح، میری بات کان کھول کر سنو۔“ وہ بولا تو آنکھوں میں غصہ اور چہرے پہ سختی در آئی تھی۔ ”اگر مجھے کبھی یہ علم ہوا کہ تم خاور یا
سعدی کو میرے خلاف۔۔۔ کسی بھی طرح۔۔۔ استعمال کرنا چاہتے ہو تو میں جو تمہارے ساتھ کروں گا، وہ تمہاری سات نسلیں یاد رکھیں گی۔“
”سر، ہم خود شاکد ہیں کہ انجیکشن۔۔۔“
”ادھ شٹ اپ! بے وقوف سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے؟“ وہ غرایا۔ ”زہر تم لوگوں کے علاوہ کون دے سکتا ہے اسے؟“
”سر، آپ یقین کیجئے میں۔۔۔“

”سعدی یوسف کبھی کسی کو قتل نہیں کر سکتا، مجھے کیا معلوم اس نے ایسا اپنے بچاؤ میں کیا ہے یا تم اپنے کیے گئے قتل اس پہ ڈال رہے
ہو۔ کل رات سے پہلے مجھے وہ انجیکشن چاہیے۔ ورنہ میں تم سب کو زمین میں گاڑ دوں گا۔“
فون بند کیا تو اس کا موڈ سخت خراب تھا۔ اسٹینڈ سے اٹھا کر کوٹ پہنا اور آئینے میں خود کو دیکھتے پر فیوم گردن پہ چھڑکی۔ تبھی دروازہ بنا
کسی دستک کے کھلا۔ ہاشم نے ناگواری سے چوکھٹ کو دیکھا۔ وہاں نوشیرواں کھڑا تھا۔ شب خوابی کی ٹی شرٹ میں ملبوس وہ سرخ آنکھوں سے
اسے دیکھتا چند قدم اندر آیا۔

”میں اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں، شیرو!“ وہ مرکز خراب مزاج سے کہتا ٹائی پن ٹائی پہ لگانے لگا۔
”وہ کون تھا؟“ وہ اتنی عجیب آواز میں غرایا کہ ہاشم نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ماتھے پہ سلوٹیں پڑیں۔ ”تمہارے میسرز کہاں
ہیں شیرو؟“

”شیرو!“ جواہرات اوپر کسی کام سے آئی تھی۔ کھلا دروازہ دیکھ کر اور شیرو کی آواز سن کر وہ متعجب سی چوکھٹ میں آکھڑی ہوئی۔
”وہ لڑکا جس نے مجھے یونیورسٹی میں پیٹا تھا۔ وہ کون تھا؟“

ہاشم کے ابرو بھینچے۔ تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ صرف ٹائی پن کو جوڑتی انگلیاں سختی سے بھینچ لیں۔ ”تم نے مجھے کبھی ایسے کسی
لڑکے کے بارے میں نہیں بتایا۔“

”مگر آپ جانتے تھے۔“ وہ چلایا۔ ”آپ نے اسے بھیجا تھا مجھے مارنے۔ کیونکہ میں نے۔۔۔ آپ کی آبدار کو کا لڑکی تھیں۔۔۔“

وہ سستی رہی۔ پھر تکان سے مسکرائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابا کی بات مکمل ہوئی اور اس کی واک۔ واپسی کا سفر خاموشی سے کٹا۔ ابا نے پھر کچھ نہیں کہا۔ وہ کہہ کر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ پیچھے پڑ جانا اور باہر انا، اولاد کو ڈھیٹ بناتا ہے اور ابا ایسا نہیں چاہتے تھے۔



ایک ضرب اور بھی اے زندگی تیشہ بدست سانس لینے کی سکت اب بھی مری جان میں ہے
اگلی صبح فارس غازی نے کاردار ایندلس کے ہیڈ آفس میں ہاشم اور جواہرات کی موجودگی میں سائن کیے۔ انھہ کران سے باری باری ہاتھ ملایا اور چند مصنوعی مبارکبادیں اور نیک تمنائیں سن کر وہ وہاں سے چلا آیا۔ اس کے جانے کے بعد جواہرات نے ہاشم کو دیکھا۔
”وہ کراچی جانے کی بات کر رہا تھا۔ کیا واقعی وہ ہماری زندگیوں سے چلا جائے گا؟ ہاشم!“
”اب مود آن کرنے کا وقت ہے مئی۔ ماضی کو ماضی میں چھوڑ کر نئی زندگی شروع کرنے کا وقت ہے۔ اس کو اس کی زندگی شروع کرنے دیں۔ جیل نے اسے سارے سبق سکھا دیے ہیں۔ اب وہ انتقام اور انصاف کے چکروں سے دور رہے گا۔“ وہ کافی مطمئن لگ رہا تھا۔
میز پینکسی کی چابی رکھی تھی۔ جو گڈول جیچر کے طور پر فارس ادھر چھوڑ آیا تھا۔ یہ انکسی ان کی ضد تھی اور وہ اور نگزب کاردار کی وجہ سے اتنے سال خاموش رہے تھے۔ پھر برے بھی نہیں بننا چاہتے تھے۔ اور اب... وہ ان کی جھولی میں آگری تھی۔ کیا شاندار آغاز تھائی زندگی کا۔
”پراہراپہ جانے کی تیاری کریں مئی!“ وہ سکون سے بولا تھا۔ شیر اور سعدی کے معاملے ذہن سے ہٹا کر وہ پراہرا انجوائے کرنا چاہتا تھا۔

سری لکا میں تین بڑے پراہرا (پریڈ) ہوتے تھے۔ تینوں ”پوپا“، یعنی ماہ کامل (پورے چاند) کی راتوں کو ہوتے تھے۔ پہلا جنوری میں ہوتا تھا۔ دوسرا فروری اور تیسرا جولائی میں۔ پجاری اور ہاتھیوں کا لشکر مندر سے شروع ہوتا اور شہر کی مختلف گلیوں کا چکر کاٹ کر اپنی منزل تک پہنچتا تھا۔ پورا شہر، اور پوری دنیا سے لوگ آ کر فٹ پاتھ پہ گھنٹوں کھڑے ہو کر پریڈ کے ان کی گلی تک پہنچنے کا انتظار کرتے تھے اور پھر اس کو گزرتے دیکھتے تھے۔ کاردارز کولبو کا ایک پراہرا ہمیشہ دیکھنے جاتے تھے۔ شہرین پہلے ساتھ جاتی تھی لیکن اب ہاشم اس کو نہیں لے کر جا رہا تھا۔ شیر وے اس نے پوچھا تک نہیں۔ سونی کی جان تھی ان ہاتھیوں میں۔ وہ اس کو لے جا رہا تھا جواہرات کے ساتھ اور وہ مطمئن تھا۔
ماہ کامل کی رات سے دو روز پہلے گارڈز سعدی اور خاد کو ان کے کمروں سے نکال کر لائے اور ایک تیسرے کمرے کے دھاتی دروازے کھولے جو صرف بجلی سے کھلتے تھے اور ان کو اندر دھکیلا۔ وہ اس کپاؤنڈ کا میکسیکم سکیورٹی روم تھا۔ اندر دو لوہے کے پلنگ رکھے تھے۔

”بہت جلد تم لوگوں کو اس جگہ سے منتقل کیا جا رہا ہے۔ تب تک تم ادھر رہو گے۔“ حیران سے سعدی کو بتایا گیا تو وہ فوراً خاموش کھڑی میری کو دیکھنے لگا جیسے بہت شاکد ہوا ہو۔

”تم نے بتا دیا ان کو؟“ میری نے نگاہیں جھکا دیں۔ خاد نے غصے سے سعدی کو دیکھا۔ ”تم نے اسے کیوں بتایا؟“
”میں سمجھا وہ بھی جانا چاہے گی۔ میری تم ایسے کیسے کر سکتی ہو؟“ وہ بے حد ہٹ لگتا تھا۔ میری خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اس نے اپنے کان گویا پلیٹ لئے تھے۔ جب دروازے قفل در قفل بند ہوتے گئے اور وہ دونوں تنہا رہ گئے تو سعدی اس کی طرف گھوما۔ ”تمہیں یقین ہے ہماری باتیں ریکارڈ نہیں ہو رہی؟“

”کوئی بھی اپنی ذاتی جیل میں کیمرے، ریکارڈر یا سر ویلنٹس نہیں لگا تا سعدی آپ کو کیا معلوم ڈی وی آر پہ بیٹھا گارڈ بک جائے اور وہ ویڈیوز جو آپ کے خلاف ڈیجیٹل وارنٹ ہیں جا کر پولیس کو دے۔ پھر بھی مجھے چیک کرنے دو۔“
خاد کا مہلک لگا گیا۔ دیواروں کو چھو کر... ٹیول کر محسوس کیا۔ کو نے چیک کیے۔ پھر پلنگ کھینچ کر چڑھا اور چھت کا معائنہ کرنے لگا۔

”سو میری اسبجو نے وہی کیا جو میں نے کہا تھا۔“ سعدی گہری سانس لے کر اپنے بیڈ کے کنارے بیٹھا۔
”تمہیں اتنا یقین کیسے تھا کہ میری ان کو بتا دے گی؟“

”وہ میرے لئے ہمدردی رکھتی ہے، مگر اسے اپنی جاب واپس چاہیے تھی۔ اسی لئے میں نے اس کو یہ موقع دیا تا کہ اس کی نوکری اسے واپس مل جائے اور ہمارے بھاگنے کے خوف سے ہمیں وہ اس میکسیکم سکیورٹی سیل میں شفٹ کر دیں۔“ کہہ کر وہ چھت کو دیکھنے لگا۔ میری کوان دونوں نے کیسے استعمال کیا تھا، میری کو کچھ علم نہ تھا۔

”سو یہ وہ سیل ہے جہاں ہارون عبید نے اپنی بیوی کو رکھا تھا؟ اور اس کو یہاں سے نکالنے کے لئے تم نے راستہ بنایا تھا۔ ویسے کیا تم اسے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟ کیا بنا تھا اس کا؟“

”تم میرے بیسٹ فرینڈ نہیں ہو۔ ایسے سوال مت پوچھو۔ آج رات سے ہم کام شروع کریں گے۔“ اب وہ دبی آواز میں کہتا اس کو اس کے حصے کا کام سمجھا رہا تھا، اور سعدی یوسف جانتا تھا کہ یہاں سے نکل کر بھی وہ خاور مظاہر حیات کا قیدی ہوگا۔



درپیش صبح و شام یہی کشمکش ہے اب اس کا بنوں میں کیسے کہ اپنا نہیں ہوں میں
فارس غازی اس رات جس وقت انیکسی پہنچا، پورا گھر برہنہ برہنہ سا لگتا تھا۔ خالی دیواریں۔ سامان کے پیک شدہ ڈھیر۔ کارٹن۔ زمر کے (اسٹڈی کم نئے کمرے) کے دروازے پر رک کر اس نے دستک دی۔ پھر اسے دھکیلا۔
وہ اپنے صوفہ کم بیڈ پہ بیٹھی (جو زمین سے دو باشت ہی اونچا تھا) فائلز سامنے پھیلائے، نوٹ بک پہ کچھ لکھ رہی تھی۔ بال جوڑے میں بندھے تھے اور ایک لٹ جھک کر کاغذ کو چھو رہی تھی۔ آہٹ پہ بھوری آنکھیں اٹھائیں تو اسے چوکھٹ میں کھڑے دیکھا۔
”آ جاؤں؟“ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا وہ سنہری آنکھیں اس پہ جمائے ذرا سا مسکرایا تھا۔
”تمہارا گھر ہے آؤ یا جاؤ۔“ وہ دوبارہ سر جھکا کر کام کرنے لگی۔ فارس دروازہ بند کر کے اندر آیا اور اس کے ساتھ بیٹھا۔
”اب یہ میرا نہیں رہا۔ میں نے بیچ دیا۔“

”تمہارے اپنے فیصلے ہیں فارس۔ کسی کو کیا اعتراض ہوگا۔“
فارس خاموش رہا۔ یہ اس کی ماں کا گھر تھا، اس کی عمر گری تھی اس میں۔ زرتاشہ کے ساتھ گزرا وقت... اچھی بری یادیں۔ وہ لئے بھر کے لئے وہ سب سوچنے لگا، پھر سر جھٹک کر زمر کو دیکھا۔ ”کافی پیو گی؟“

وہ سر جھکائے ذرا سا مسکرائی۔ (واہ فارس غازی! آج آپ میرے لیے کافی بنائیں گے!) اور چہرہ اٹھایا۔ ”شیور۔“
”تھینکس۔ میری کافی میں چینی مت ڈالنا، اور کافی زیادہ ہو۔“ اب وہ ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا۔ زمر کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

”ایک منٹ۔ ہم میں سے کون کافی بنا رہا ہے؟“

”زمر بی بی، ابھی میں اتنا زن مرید نہیں ہوا کہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے اپنی بیوی کے لئے کافی بناؤں۔ اس لئے آپ بنائیں گی۔“ وہ کبھی نہ اٹھتی مگر اس نے اسے آپ کہا تھا۔ عرصے بعد۔ اچھا لگا تھا۔ بظاہر کاغذ خنجر کراٹھی۔ ”صرف اس لئے بنا رہی ہوں کیونکہ میرا اپنا دل چاہ رہا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ دو بھاپ اڑاتے کپ لئے اندر داخل ہوئی، ایک اسے تھمایا اور دوسرا خود لے کر ساتھ بیٹھی۔ فارس اکڑوں انداز میں بیٹھا تھا، اور وہ پیر اوپر سمیٹ کر دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھی۔ دونوں اپنی سوچوں میں گم گھونٹ گھونٹ کافی پینے لگے۔
”کل ہارون عبید کی چائے پہ مدعو ہیں ہم۔“

”یہ دعوت تمہاری گرل فرینڈ نے دی ہے یا اس کے باپ نے؟“

وہ ہلکا سا ہنس دیا اور کافی کا گھونٹ بھرا۔ ”وہ میری گرل فرینڈ نہیں ہے!“

”اوہ سوری! مجھے بھول گیا، تمہاری کوئی گرل فرینڈ کیسے ہو سکتی ہے۔ تمہارے تو 32 ailibis تھے نا۔“

”استغفر اللہ!“ اس نے خفگی سے اسے دیکھا۔ ”میں صرف کافی پینے گیا تھا۔ صرف ایل بی بائی بنانے۔ فوئج نکالی، پکچرز لیں اور آ

کیا۔ ایسی جگہوں پہ نہیں جاتا میں۔“

”مجھے کیا معلوم۔ رات گئے تک گھر سے باہر ہوتے ہو۔ کہاں جاتے ہو کیا کرتے ہو۔“ شانے اچکا کر وہ گھونٹ گھونٹ کافی

پینے لگی۔

وہ مسکرا کر رہ گیا۔ ”نارمل کپڑا ایسی باتیں پوچھتے ہیں۔ ہم نارمل نہیں ہیں۔“

”سعدی کی غیر موجودگی میں ہم میں سے کسی کی زندگی نارمل نہیں ہو سکے گی۔ فارس۔“ اس نے کپ پرے رکھا اور سنجیدگی سے اس

کی طرف مڑی۔ ”ہم اسے کیسے ڈھونڈیں گے اب؟ مجھے تو کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔“

”میں ڈھونڈ رہا ہوں، وہ مل جائے گا۔“ اس نے تسلی دی۔ اور زمر نے اس پہ اعتبار کر لیا۔ وہ کرنا بھی چاہتی تھی۔ پچھلے چند ماہ فارس کو

نیل سے نکالنا ان کے سروائیول کا مسئلہ بن چکا تھا اور سعدی کی تلاش پس منظر میں چلی گئی تھی۔ کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا۔ مگر فارس کو رہا ہوئے

تین دن بیت چکے تھے اور تین دن سے وہ یہی سوچ رہی تھی۔ کیا کرے؟ کیسے کرے؟

”ہارون عبید کی چائے تمہارے حلق سے اتر جائے گی، یہ جانتے ہوئے کہ اس کا ہاتھ ہے اس سب میں؟“ وہ کئی دفعہ یہ بات اس

سے کہہ چکی تھی اور فارس کبھی اس پہ تبصرہ نہیں کرتا تھا۔ (باشم کا نام وہ نہیں لیتی تھی، وہ اسے گولی ہی نہ مار آئے!)

”میرے حلق سے بہت کچھ اتر جاتا ہے۔“ کپ اٹھائے وہ کھڑا ہو گیا۔

”کل ہم موو کر جائیں گے۔ مجھے پتہ ہے تم تھکی ہوئی ہو گی مگر چائے پہ جانا ضروری ہے۔ تیار رہنا۔“ زمر نے صرف سر ہلا دیا۔ وہ

اب سوچ میں گم، گھونٹ بھرتا باہر جا رہا تھا۔



میرے شوق کی یہیں لاج رکھ! وہ جو طور ہے بہت دور ہے!

وہ ایک ساکن سی شام تھی۔ سردی گویا قلفی جماتی تھی اور ہڈیوں کے اندر تک درد کر دیتی تھی۔ آسمان پہ پورا چاند چمک رہا تھا۔ ماہ

کامل۔ پویا۔ بدر۔

چینی پورے چاند کو ”فیملی ری یونین“ کی علامت سمجھتے ہیں۔ ماہ کامل کی رات چینی خاندان کے دورِ مقیم بیٹے بیٹیاں لوٹ کر اپنے

گھروں کو آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ”گاؤں کے (خاندانی گھر) کے آسمان کا چاند زیادہ چمکیلا ہوتا ہے۔“ ساری دنیا کہتی ہے کہ جوڑے

آسمانوں پہ بنتے ہیں، مگر چینی کہتے ہیں کہ جوڑے بنتے آسمانوں پہ ہیں مگر ان کی تیاری چاند پہ ہوتی ہے۔ ان کی لوک کہانیوں میں آتا ہے کہ

چاند پہ چانگ ای نام کی پری اپنے لکڑ ہارے کے ساتھ رہتی ہے اور اس نے آبِ حیات پی رکھا ہے۔

بدھسٹ لوگ ماہ کامل کو مبارک جانتے ہیں کیونکہ بدھا کی زندگی میں سارے اہم واقعات ماہ کامل کی رات کو پیش آئے تھے۔ وہ

اس رات کو انسان کی روحانی اور مذہبی زندگی کے لیے اہم سمجھتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اس رات انسان اپنے دین کی طرف پلٹتا ہے۔

ہندوؤں کا ماننا ہے کہ چاند پانی کو چونکہ کنٹرول کرتا ہے اس لیے ساری دنیا کو کنٹرول کرتا ہے اور وہ اس کا تعلق مقدس گائے سے

جوڑتے ہیں۔ چند ادیان اس بات پہ بھی ایمان رکھتے ہیں کہ ماہ کامل کی رات عہد لینے یا وعدے کرنے کے لیے اچھی نہیں ہے۔ طبی ماہرین

کہتے ہیں کہ چاند انسانی جسم کے اندرونی پانی پہ بھی ایسے ہی اثر انداز ہوتا ہے جیسا کہ سمندر کی لہروں پہ۔ دماغی امراض یا دسے اور جلد کی بیماریوں میں مبتلا لوگوں کی حالت اس رات زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ Yale میں ہونے والی ایک تحقیق یہ بھی کہتی ہے کہ پورے چاند کی رات اگر کسی کا خون بہے تو وہ عام دنوں سے زیادہ بہتا ہے۔

فرشتے کہتے ہیں کہ چاند کی چند مخصوص تاریخیں کپنگ (حجامہ) کے لیے زیادہ شفا بخش ہیں۔ اور قدیم داستانیں یہ کہتی ہیں کہ اس رات کچھ (ویردولف) انسان بیٹھریے بن جاتے ہیں اور صبح ہوتے ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ امریکی کہتے ہیں کہ انہوں نے چاند پہ قدم رکھا تھا اور دنیا میں بہت سے کانسپر ایسی تھیورسٹ اس بات کو ایک ڈرامے کے سوا کچھ نہیں مانتے اور وہ ٹھوس دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ آج تک کسی انسان نے چاند پہ قدم نہیں رکھا۔ نیل آرم اسٹرانگ کی موت کے ساتھ ہی یہ راز کہ انسان نے چاند تسخیر کیا تھا یا نہیں بھی دفن ہو گیا ہے۔ اور دنیا کے سب سے عظیم انسان... ہمارے نبی محمد ﷺ نے ”ومن شر غاسق اذا وقب“ کی تشریح میں فرمایا ہے کہ ”غاسق چاند ہے“ اور ہر قرآن پڑھنے والا اس آیت کو پڑھ کر چاند کے شر سے پناہ مانگتا ہے۔

اور دنیا والوں سے بے نیاز وہ چاند کی کا تھاں اس رات سرد سے آسمان پہ چمک رہا تھا۔ پورا۔ مکمل۔ پویا۔

فارس غازی کا خاندان ایک پوش علاقے کے اس بنگلے میں آبا تھا۔ بگلہ سبز بیلوں سے ڈھکا تھا اور کافی خوبصورت تھا۔ انکیسی سے کئی گنا کم قیمت مگر اس سے کہیں زیادہ کھلا اور بڑا۔ ہر کسی کو اس کا اپنا کمرہ ملے گا، سیم اس بات پہ خوش تھا اور اب ندرت، حسینہ اور صداقت کے ساتھ مل کر سامان رکھوار ہا تھا۔ سب تھک بھی گئے تھے اور اس وقت وہ حال تھا کہ ندرت کچھ مائتیں توحنہ اور سیم ایک دوسرے کو اشارہ کرتے ”تم قریب ہو، تم اٹھاؤ گے۔“ اور یہ تو بہن بھائیوں کا پرانا اصول ہے کہ ”قریب“ والا ہی کام کرے گا، سو زیادہ شامت سیم کی آرہی تھی۔

گھر کسی حد تک سیٹ ہو چکا تھا، زمر اور فارس چائے پہ جا چکے تھے۔ حنین اب صرف خالی خالی سی تھی۔ قصر کو گردن اونچی کر کے دیکھنے کی اتنی عادت ہو گئی تھی کہ اب گردن اور دل دونوں درد کرنے لگے تھے۔ اتنے دن سے نماز نہیں پڑھ رہی تھی۔ نہ ادا نہ قضا۔ دل ویران تھا۔ سو امی کی ڈانٹ ڈپٹ کو ان سنی کر کے وہ اپنی نیچر کے پاس چلی آئی تھی۔ ان کا گھر چند منٹ کی واک پہ تھا۔ (یاد رہے کہ وہ اپنے پرانے علاقے میں ریٹنورائٹ کے قریب ہی آجے تھے)۔ اب ان کے ڈرائیونگ روم میں ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھے وہ ایک دفعہ پھر اپنی کمزوریوں کا اقرار کر رہی تھی۔ نماز کی عادت نہیں بنتی، وہ کیا کرے؟ وہ عینک اتار کر اسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”ظہر اور مغرب تو سب پڑھ ہی لیتے ہیں، لیکن عصر کی قضا ہوتی ہے، اور فجر اور عشاء کون چھوڑ دیتا ہے؟ کیا آتا ہے حدیث میں؟“

”منافق!“ وہ جھٹ بولی۔

”اور منافق کون ہوتا ہے؟ کافر؟ مشرک؟ ہندو؟ یہودی؟“

حنین نے نفی میں سر ہلایا۔ ”منافق کلمہ گو مسلمان ہوتا ہے، جو ایمان نہیں لاتا، صرف اسلام لاتا ہے۔“ حنین کا سر جھک گیا۔ کونے میں جلتے بیڑ کی حدت سے چہرہ دیکھنے لگا۔

”چوری کرنے والا منافق نہیں ہوتا، حتیٰ کہ بدکار بھی منافق نہیں ہوتا، پھر منافق کون ہوتا ہے بھلا؟“

”جو بات کرے تو جھوٹ بولے، امانت رکھے تو اس میں خیانت کرے، لڑے تو گالی دے، وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے۔“

”جھوٹا، خائن، وعدہ خلاف اور بد زبان۔“ نیچر نے انگلیوں پہ گنویا۔ ”یہ چاروں یا ان میں سے ایک چیز بھی کسی میں ہو تو وہ

منافق ہوتا ہے۔ جھوٹ زبان سے بولا جاتا ہے، گالی زبان سے دی جاتی ہے، وعدہ زبان سے کیا جاتا ہے، امانت کی ذمہ داری زبان سے لی جاتی ہے!“

حنین نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو کیا چیز منافق کو نماز سے دور کرتی ہے؟“

”اس کی زبان!“ وہ چونکی۔

”جھوٹ، خیانت، بدزبانی، غلط الفاظ بولنا، بات سے پھر جانا، حیلے بہانے کرنا، غیبت کرنا کہ مسلمان کی عزت بھی ہمارے اوپر امانت والی ہے یہ سارے گناہ انسان کو دوغلا بنا دیتے ہیں۔ گندا کر دیتے ہیں۔ ان سے دور رہو گی تو نماز کے قریب آؤ گی۔ اب یہ مت کہنا کہ فلاں تو انا ہموں اور بدزبان ہے مگر فجر پڑھتا ہے۔ ہمیں کچھ نہیں پتہ کون کیسی نماز پڑھتا ہے۔ نہ کسی کو یوں جج کرنا چاہیے۔ صرف اپنا معاملہ دیکھو۔“

حنین کے اندر باہر کچھ ہل کر رہ گیا تھا، مگر وہ بولے جا رہی تھیں۔

”یہ تو ہو گیا کہ نماز سے کیا روکتا ہے۔ اب بتاؤ نماز خود کیا ہے؟“ کچھلی دفعہ کا سوال دہرایا۔ وہ اب بھی چپ رہی۔

”یوں کرو!“ انہوں نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ ”وضو کر کے آؤ اور میرے سامنے ایک رکعت نماز پڑھو۔ نہیں، یہ اصلی والی نماز نہیں ہوگی، ابھی عصر کا وقت بھی داخل نہیں ہوا۔ یہ کوئی scholarly advice بھی نہیں ہے، نہ اس مشق کا تعلق دین سے ہے۔ یہ تو صرف ایک ریہرسل ہوگی۔ جیسے اصل چیز سے پہلے ہم ریہرسل کرتے ہیں نا۔ اسی طرح۔ جاؤ۔“ ہاتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔ وہ متذبذب بن گئی۔

کچھ دیر بعد وہ جائے نماز بچھائے کھڑی تھی۔ ٹیچر کا صوفہ اس کی پشت پہ تھا اور یہاں سے اس کو صرف ان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دوپٹہ پلیٹ کر اس نے مدھم آواز میں تکبیر تحریمہ کے لئے ہاتھ بلند کیے۔

”اللہ اکبر!“ کہہ کر اس نے ہاتھ باندھے۔ وہ ابھی تک ہیجان میں تھی۔ پیچھے سے ٹیچر کہنے لگی تھیں۔

”نماز کے لئے کھڑے ہوتے وقت تم اعتراف کرتی ہو کہ ”اللہ سب سے بڑا ہے۔“ تمہاری ہر مصروفیت ہر ضروری کام سے بڑا ہے۔ جب اس کی اذان آگئی تو تم چھوٹی ہو گئی اور اس کی بڑائی تسلیم کر کے مصلے پہ آ کھڑی ہوئی۔“ وہ خاموش ہوئیں تو ان کی طرف پشت کیے کھڑی حنین سینے پہ ہاتھ باندھے مدھم آواز میں پڑھنے لگی۔

”سبحانک اللہم...“ (اے اللہ! پاک ہیں آپ اپنی تعریف کے ساتھ اور بابرکت ہے آپ کا نام اور بہت بلند ہے آپ کی شان اور آپ کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں ہے۔)

”جب نماز کی پکار آتی ہے تو تم کسی نہ کسی کام، کسی مسئلے میں الجھی ہوتی ہو۔ مگر تم سب چھوڑ کر اللہ کے سامنے آتی ہو اور اس کو کہتی ہو کہ آپ پاک ہیں ہر عیب سے، انسانوں کی طرح نہیں جو دھوکے دیتے ہیں، دکھ دیتے ہیں، کوئی اللہ، آپ کے لیول کو نہیں پہنچ سکتا۔ میرے لئے سب سے بڑا نام آپ ہی کا ہے۔ میں آپ کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں جھکوں گی، نہ کسی انسان کے سامنے نہ حالات کے!“

حنین خاموشی سے سن رہی تھی، پچھلا لب مسلسل کاٹتے ہوئے۔ وہ چپ ہوئیں تو وہ اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر الفاتحہ پڑھنے لگی۔

”سب تعریف (سب شکر) اللہ کے لئے ہے جو رب ہے دونوں جہانوں کا۔ وہ رحمن ہے رحیم ہے۔“ وہ ٹھہری۔

”کبھی الفاتحہ پہ غور کرو۔ یہ قرآن کا دروازہ ہے۔ اس سے گزر کر ہی قرآن ملتا ہے۔ اس میں تم اللہ کا شکر ادا کرتی ہو کہ اللہ آپ ہی دونوں جہانوں کے خالق، مالک اور مدبر ہیں۔ آپ رحمن ہیں، ساری کائنات کے لئے چاہے کوئی مومن ہو یا کافر، انسان ہو یا چرند پرند۔ اور آپ رحیم ہیں مومنوں کے لئے رحیم یعنی بار بار رحم کرنے والا۔ آپ بار بار ہمارے گناہ معاف کر کے ہمیں ایک اور موقع دینے والے ہیں۔“

”وہ مالک ہے جزا کے دن کا۔“ الفاظ اس کے لبوں میں پھر بھڑائے۔ وہ سر جھکائے ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

”جزا کا.. بدلے کا دن... یہ آیت پڑھتے ہوئے اپنے سارے گناہوں کو سوچا کرو جن کا بدلہ ایک دن تمہارے سامنے لایا

جا سکتا ہے۔“

”ایک نعبہ وایاک نستعین۔“ وہ سر جھکائے ہاتھ باندھے بہت آہستہ سے پڑھ رہی تھی۔

”اب تم کہہ رہی ہو کہ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ تمہیں ہر نماز کی ہر رکعت میں یہ آیت پڑھنی ہوتی ہے، کیونکہ بیٹا دو نمازوں کے درمیان بہت سے معاملات آتے ہیں، مسئلے پریشانیاں چلیں گے۔ اللہ چاہتا ہے تم ہر نماز میں کھڑی ہو کر اس سے کہو کہ تمہیں صرف اسی کی مدد چاہیے۔ جب بار بار کہو گی تو پھر کیا وہ مدد نہیں کرے گا؟“

حنہ نے لمحے بھر کے لئے آنکھیں زور سے میچیں۔ دل پہ کوئی آنسو زور سے گرا تھا۔

”دکھائیے ہم کو سیدھا راستہ۔ ان لوگوں کا راستہ انعام کیا ہے جن پہ آپ نے۔ نہ کہ ان کا راستہ جن پہ آپ نے غضب کیا، اور نہ ان کا جو گمراہ ہیں۔ آمین!“

”ہر دو نمازوں کے درمیان تم نے بہت سے فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ چاہے وہ آج کیا پکانے کے متعلق ہیں یا کسی کے گھر جاتے ہوئے کپڑے کون سے پہننے ہیں۔ اب تم کہو گی کہ نماز کا اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے کیا تعلق؟ مگر نہیں جنین۔ نماز کا ہماری ہر چھوٹی ہر بڑی بات سے تعلق ہوتا ہے۔ اس آیت کا پڑھنا تمہارے ہر فیصلے کو آسان کر دیتا ہے۔“

وہ سورۃ اخلاص پڑھ کر اب رکوع میں جھک گئی۔

”سبحان ربی العظیم۔“ وہ تین دفعہ دہرا رہی تھی۔

”میرا عظیم رب بہت پاک ہے۔ یہ اعتراف اللہ کے سامنے کرنے کے لئے رکوع میں جھکنا کیوں ضروری ہے؟ مجھے نہیں پتہ نماز کی symbolic اہمیت کیا ہے، مگر بس اتنا پتہ ہے جنین، کہ رکوع میں انسان معلق ہوتا ہے۔ اس کا سر اس کی انا اور غور کا سر چشمہ اس کی عزت کی علامت اس کا سر... وہ نہ زمین پہ ہے۔ نہ اپنے کندھوں پہ کھڑا ہے، بلکہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہے۔ ایسے بھی حالات آتے ہیں نازندگی میں جب ہم بالکل معلق ہوتے ہیں تو ایسے وقت میں بھی یہ احساس ہونا... کہ ”میرا عظیم رب بہت پاک ہے“ یعنی وہ سب سے اوپر ہے اور وہ آپ کو دوبارہ سیدھا کھڑا کر دے گا... یہ بات ہمیں ہر روز از سر نو یاد کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔“

وہ بہت ضبط اور تحمل سے دوبارہ سیدھی کھڑی ہوئی۔

”سمع اللہ لمن حمدہ۔ ربنا دلائل الحمد۔“

(سن لیا اللہ نے اس شخص کو جس نے اس کی تعریف بیان کی۔ اے ہمارے رب، سب تعریف آپ ہی کے لئے ہے۔)

”اور سیدھا کھڑے ہوتے تمہیں یہ یقین دہانی ہوتی ہے کہ جو تم کہہ رہی ہو وہ اللہ سن رہا ہے اور اللہ اس کی قدر کرتا ہے۔ وہ تمہیں سمجھتا ہے تمہاری ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو سمجھتا ہے، اور اگر کوئی ایسا دوست مل جائے انسان کو تو اسے اور کیا چاہیے ہوتا ہے؟“

جنین نے پھر زور سے آنکھیں میچ کر کھولیں۔ نمی ضبط سے اندر ہی اتار دی۔ اور نیچے جھکی۔ گھٹنے زمین پہ لگائے۔ ہاتھ پھیلا کر سجدے کی جگہ پر رکھے اور پیشانی ٹیکتے ہوئے مہم آواز میں بولی۔ ”سبحان ربی العلیٰ۔“ (پاک ہے میرا برتر رب۔)

”سجدے کے استغفارات پڑھتے ہوئے تمہیں چاہیے کہ اپنے گناہوں کو یاد کرو، مگر اس امید کے ساتھ کہ وہ تمہارا رب ہے، اور وہ بہت بلند ہے، انسانوں کی طرح دل میں بغض نہیں رکھتا۔ تم معافی مانگو گی تو معاف کر دے گا کیونکہ صرف وہی معاف کر سکتا ہے۔ وہ ”غافر“ ہے۔ گناہوں کو ڈھانپنے والا۔ خاموشی سے ان کو ڈھانپ دے گا۔ لوگوں کو نہیں بتائے گا۔ تم اس سے کہو گی کہ کسی کو مت پتہ چلے دیتے گا، تو وہ نہیں پتہ چلے دے گا کسی کو۔ اس سے کہہ کر تو دیکھو۔“

سجدے میں ماتھا ٹیکے بھی اس نے بہت برداشت سے گلے تک آئے آنسو اندر اتارے۔ اونہوں۔ وہ بہت مضبوط ہے ایسے تو نہیں

جذباتی ہوگی۔ پھر اللہ اکبر کہتی اٹھ بیٹھی۔ پھر دوبارہ سجدے میں گئی۔

”اور تم نے کبھی سوچا جنین... سجدے کے استغفارات میں معافی بھی ہے، اور ”حمد“ بھی۔ حمد یعنی تعریف اور شکر۔ سو جہاں تم اپنی ساری انا، غرور بھلا کر اللہ کے سامنے، اپنے ہی قدموں کے لیول پہ اپنا سر رکھتی ہو۔ وہاں تم صرف معافی نہیں مانگ رہی ہوتی، بلکہ شکر بھی ادا کر رہی ہوتی ہو۔ تمہاری بری عادتیں چھڑوانے کا شکر، پرانے گناہ ڈھانپنے کا شکر، تمہیں دنیا کی ہر نعمت دینے کا شکر، اور تمہیں اپنے سامنے سجدہ کرنے کی توفیق دینے کا شکر۔ یہ ہر کسی کو یہ نہیں ملتی۔ اور آسانی سے نہیں ملتی۔“ جنین اٹھ گئی۔ ضبط سے چند گہرے سانس لیتے اس نے خود کو نارمل کر لیا، اور سر جھکائے بیٹھے ہوئے التحیات پڑھنے لگی۔

”التحیات للہ والصلوٰۃ والطیبات۔“

(میری ساری قولی، بدنی اور مالی عبادات صرف اللہ کے لیے خاص ہیں۔ اے نبی! آپ پہ اللہ تعالیٰ کی رحمت، سلامتی اور برکتیں ہوں۔ اور ہم پر۔ اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی سلامتی ہو۔ میں گواہی دیتی ہوں کہ نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔)

”تم اب سلام بھیجتی ہو... اللہ کے نبیؐ پہ... اور تم ان کو گویا مخاطب کر کے کہتی ہو... سلام ہو آپ پہ یا نبیؐ... کیونکہ یہ وہی نبی ﷺ ہی ہیں جنہوں نے تمہیں نماز سکھائی ہے۔ یہ وہی ہیں جو تمہارے لئے معراج پہ بار بار واپس گئے تھے اور نمازوں کی تعداد کم کروائی تھی۔ یہ وہی ہیں جو اپنی آخری سانس تک فرماتے رہے تھے نماز نماز نماز۔ یہ وہی ہیں جو تینیس سال تمہارے لئے ہر کسی سے لڑے تھے، تمہارے لئے انہوں نے اسٹینڈ لیا، تمہارے لئے وہ روئے، اور روز قیامت بھی تمہارے لئے... تمہاری امت کے لئے آواز بلند کریں گے... اور ہم لوگ کہتے ہیں فلاں چیز صرف سنت ہی تو ہے، فرض تھوڑی ہے، اور حدیث کا کیا ہے، پتہ نہیں بچ ہو یا نہ ہو۔“

اور یہ بہت تھا۔ حنہ کے لیے اتنا بہت تھا۔ اس کے آنسو پمپ مپ گرنے لگے۔ گرم پانی سے چہرہ بھینگنے لگا۔

”پھر تم درود پڑھتی ہو۔ محمد ﷺ پہ درود اور سلام بھیجتے، ان کے اور ان کی آل کے لئے برکت کی دعا کرتے، تم ایک دم سے ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کر دیتی ہو۔ ایک دم سے... اچانک سے... ہمارے درود کا حصہ ابراہیم بن جاتے ہیں۔ کون تھے ابراہیم؟ وہ جنہوں نے وفا کا حق ادا کیا تھا۔ وہ جن کے پاس قلب سلیم تھا۔ وہ جو کسی اور کے سامنے نہیں جھکے۔ بھیڑ چال کا حصہ نہیں بنے۔ اپنی عقل استعمال کی۔ اپنا اللہ خود ڈھونڈا۔ اور جب ڈھونڈ لیا تو اس کو کھویا نہیں۔ انہوں نے نہیں کھویا تو تم نے کیسے کھو دیا؟“

آنسو اسی طرح اس کے گالوں پہ بہہ رہے تھے۔ وہ زیر لب ”رب ارحم الراحمین“ پڑھ رہی تھی۔

”اور اب تم دعا بھی ابراہیم علیہ السلام والی مانگ رہی ہو۔ اللہ کو ان کی دعائیں کتنی پسند تھیں کہ ان کو قرآن اور نماز میں محفوظ کر دیا۔ تم کہہ رہی ہو اے میرے رب مجھے بنائے نماز کا پابند، اور میری اولاد کو بھی اے ہمارے رب، اور ہماری دعا قبول فرمائیں اے ہمارے رب مجھے معاف کر دیں، اور میرے والدین کو بھی اور تمام مومنوں کو، حساب کے کھڑے ہونے کے دن!“

وہ اب دائیں بائیں چہرہ گھما کر سلام کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے چہرہ سامنے ہی کیے رکھا۔ پیچھے نہیں موڑا۔ وہ آنسوؤں سے بھیگا تھا۔

”اگر نماز سمندر ہے تو میں تمہارے ساتھ ایک قطرہ ہی شیر کر پائی ہوں۔ اس کا مطلب اس کی پابندی کے ساتھ ہی کھلتا جائے گا تمہارے اوپر، لیکن اگر تم اس کا مطلب سمجھ جاؤ تو یہ تمہارے اوپر آسان ہو جائے گی۔ تم اس کا انتظار کرو گی، کیونکہ تمہارے پاس ہر نماز میں اللہ سے شیر کرنے کے لئے بہت کچھ ہوگا۔ تمہیں اس میں مزہ آنے لگے گا۔ یہ اللہ سے ”بات کرنا“ ہے۔ یہ معراج پہ عطا کی گئی تھی رسول اللہ ﷺ کو۔ معراج پہ وہ اللہ سے ہم کلام ہونے گئے تھے۔ ہم تو نہیں جاسکتے آسمانوں پہ، ہم تو طور پہ بھی نہیں جاسکتے، تو ہمارے شوق کلام کی لاج اللہ نے نماز کے ذریعے رکھ لی۔ ہمارا طور، ہماری معراج ہماری نماز ہے۔ اس کی عادت پکی ہوئی چاہیے، کیونکہ اگر ہم اپنے بچوں کو نماز کے لئے ویسے

نہیں اٹھاتے جیسے اسکول کے لئے اٹھاتے ہیں تو ہم ان کو ساری عمر کے لئے اندھے کنویں میں دھکیل دیتے ہیں۔ سردی ہو یا گرمی بچہ تندرست ہے یا بیمار اسے پیار سے پکارنا پڑے یا کان سے پکڑ کر بستر سے کھینچ کر نکالنا پڑے اسے اٹھایا جانا چاہیے۔ اسکول کے لئے اٹھاتے تو ہمیں ان کو سوتے دیکھ کر ترس نہیں آتا پھر نماز کے لئے اٹھاتے وقت کیوں آجاتا ہے! ”وہ آہستہ آہستہ بولتی تھیں بول کر نہیں تھکتی تھیں۔ حنہ دھیرے سے اٹھی جائے نماز تہہ کی اور واپس کرسی پہ آ بیٹھی۔ گلابی آنکھوں کے ساتھ سر جھکا لے وہ بولی تھی۔

”ابھی جوش تازہ ہے گھر جا کر پھر سب پرانا ہو جائے گا۔ نماز پڑھ لوں گی مگر قائم کیسے رکھوں گی؟“

”ساری مسلمان قوم ایک ہی پیر کی مرید ہے اور وہ ہے ”ڈنڈا“۔ کہتے ہیں آسمان سے اتریں چار کتابیں اور پانچواں اتر اڈنڈا۔ حنین نماز کی عادت سات سال کی عمر میں نہیں ڈالی جائے تو اکیس سال کی عمر میں تم بغیر ڈنڈے کے اسے نہیں ڈال سکتیں۔ صرف دو ماہ کے لیے اپنے اوپر ڈنڈا رکھو۔ ساری عمر کی نماز پکی ہو جائے گی۔ لکھ کر رکھ لو۔“

”مگر اس عمر میں میں امی کی ڈانٹ سے نہیں ڈرتی نہ ان کے جوتے سے۔“

”تمہیں اپنا ایک نماز نگہبان بنانا پڑے گا۔“

”نماز نگہبان؟“ وہ حیران ہوئی۔

”ہاں۔ اپنی کسی ایسی جاننے والی لڑکی کو اپنا نگہبان مقرر کرو جو تمہاری بیسٹ فرینڈ نہ ہو اس سے اتنی بے تکلفی نہ ہو کہ وہ تمہیں رعایت دے۔ کوئی ٹیچر ہو کوئی بڑی لڑکی ہو جس کا تم سے ذرا ریز روڈ اور ادب والا رشتہ ہو۔ اس سے تم کہو گی کہ وہ تم سے روز پوچھے کہ آج تم نے کتنی نمازیں پڑھیں۔“

”یوں تو میں اس کے ڈر کی وجہ سے پڑھوں گی نیت میں تو کھوٹ آ جائے گا۔“

”واہ ابلیس... واہ۔“ انہوں نے مسکرا کر گہری سانس لی۔ ”شیطان جب ”بائیں“ سے نہیں آ سکتا تو وہ ”دائیں“ سے آتا ہے۔ یعنی جب وہ تمہیں کسی اچھے کام سے روکنے کے لیے ”بری چیزوں“ کی ترغیب نہیں دے سکتا جیسے نماز سے روکنے کے لیے میوزک اور گانوں کی تو وہ تمہیں ”اچھی چیز“ کے ذریعے خراب کرتا ہے۔ تمہاری اپنی نیت میں شک ڈالتا ہے۔ کسی کے سامنے نماز پڑھ رہی ہو تو کہے گا تم تو ریا کاری کر رہی ہو تمہاری نیت خراب ہے فلاں فلاں۔ اس سے تم پریشان ہو جاؤ گی اور عبادت کی لذت ختم ہو جائے گی۔“ انہوں نے لمحے بھر کا توقف کیا۔ ”بچہ نماز نہ پڑھے تو اسے سمجھانے ڈانٹنے پھر مارنے تک کا حکم ہے۔ تو بچہ پھر کیوں پڑھے گا؟ ماں باپ کے ڈر سے نا؟ تو کوئی بات نہیں۔ کسی کے ڈر سے تو پڑھے گا۔ عادت بنے گی۔ بڑا ہو گا تو خود سمجھ جائے گا۔ تم بڑی ہو مگر ابھی ”نماز“ میں grow نہیں کیا تم نے۔ آہستہ آہستہ کرو گی پھر اللہ کا ڈر آتا جائے گا۔ سو حنین اچھی عادتیں ڈالنے کے لیے کوئی ڈنڈا ملے یا کوئی انسپریشن ملے وہ لے لینی چاہیے۔ تم اللہ کے لیے ہی یہ کر رہی ہونا۔“

بات حنین کے سمجھ میں آ گئی تھی۔ بہت عرصے بعد... اس کے ذہن نے فخر کی نیند کا ”ترياق“ ڈھونڈ لیا تھا۔



زندگی کے بارے میں اک خیال یہ بھی ہے آج زندہ رہنے سے جان دینا آسان ہے
ماہ کامل کو لمبو کے آسمان پہ بھی دمک رہا تھا۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ ہوٹل اسٹریٹ کے اوپر واقع تھا۔ اونچی سی عمارت شان سے کھڑی تھی۔

اور پوری اسٹریٹ اس وقت آہستہ آہستہ رش سے بھر رہی تھی۔ لوگ فٹ پاتھ کے کناروں پہ آ کر بیٹھنے لگے تھے۔ جوش و جذبے سے بھرپور چند گھنٹیاں انہیں گزاری تھیں پھر پراہر اپنا سفر طے کرتا مختلف گلیوں سے ہوتا ادھر آتا تھا۔

ایش گرے سوٹ میں ملبوس، تازہ دم اور وجہہ ہاشم اپنے سیل فون کے بٹن دباتا، ہوٹل کی لابی میں بیٹھا تھا۔ قریب میں اس کے دو ساتھیوں میں ملبوس گارڈز مستعد کھڑے تھے۔ ہاشم گاہے بگاہے گھڑی پر نظر دوڑاتا، گویا وہ انتظار میں تھا۔

نیچے تہ خانے کا میکیکم سکیورٹی سیل خاموش پڑا تھا۔ میری نے کھانا لا کر رکھا اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی وہ اداں تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”یہ اب ایک گھنٹہ بعد چائے کے لئے آئے گی۔ ہمارے پاس صرف ایک گھنٹہ ہے۔“

خاور آگے بڑھا اور سعدی کے ساتھ کل پرلنگ اٹھا کر دوسرے کے اوپر رکھا۔ اب دونوں اس کے اوپر چڑھے یہاں تک کہ خاور نے ہاتھوں نے چھت کو چھو لیا۔ وہاں ایک تیز روشنی والا لائٹ فلکسچر لگا تھا۔ اسکی پلیٹ کے کٹے وہ رات کو ہی ڈھیلے کر چکے تھے۔ اب کانٹے سے (وہ پاؤلوں کے ساتھ آیا تھا) ذرا سا گھمایا تو کیل پیچ علیحدہ ہو گئے اور پلیٹ ہاتھ میں آگئی۔

”کیا کسی کو اس راستے کے بارے میں نہیں علم؟“ سعدی نے بے چینی سے پوچھا۔

”یہ جیل میں نے ڈیزائن کی تھی۔ مجھے بیس دن دے تھے ہارون عید نے۔ اتنے وقت میں بھی اگر میں یہ راستہ نہ رکھتا تو کرنل خاور ہوتا۔ میں نے یہ ہاشم کے لئے کیا تھا، کہ ہو سکتا ہے اسے ’مسز عبید کو نکالوانے میں کوئی فائدہ ہو۔“

”تم بھی شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار ہو۔“ سعدی نے مسکرا کر سر جھکا۔ خاور نے گھور کر اسے دیکھا اور پھر پلیٹ ہٹائی۔ اوپر لوہے کی چادر تھی۔ اس نے انگلیوں سے ٹول کر کونے میں ایک جگہ کو دبایا۔ فوراً ہی لوہے کی چادر سلائیڈ کر کے ہٹتی گئی۔ آگے سیاہ تھا۔

پہلے سعدی اوپر چڑھا اور پھر خاور۔ اندھیرے میں اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا چاہا۔ وہ ایک ایلی وینٹرفٹ تھی۔ جس میں لونی لفٹ نہ تھی مگر لفٹ کا پورا راستہ سا بنا تھا۔ اوپر عمارت کے اختتام تک۔ ذرا ذرا فاصلے پہ ننھے ننھے بلب لگے تھے۔ ذرا دیر بعد آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو وہ راستہ صاف دکھائی دینے لگا۔ لوہے کے جنگلے.... راڈز اور ڈنڈے... درمیان سے لفٹ جتنی جگہ بالکل خالی۔ سچ سچ کراؤ پر چڑھنا تھا اور اگر راستے میں پیپر پھسلے تو یہاں سے لاش بھی نہ ملتی۔

اوپر آ کر خاور نے لوہے کی چادر بند کر دی۔ اب وہ دونوں احتیاط سے ٹول ٹول کراؤ پر چڑھنے لگے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ باہر کچن میں بیٹھی میری نے بے اختیار ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ گارڈ نے استغفامی نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ کھانا کھانے سے پہلے مجھے چکھنے کا کہتا ہے۔ اگر نہ چکھا ہو تو گھنٹے بعد بھی کھانا یونہی رکھا ہوگا۔ ذرا میرے ساتھ آؤ“ میں پہلے اس کا کھانا چکھ لوں۔“ برے موڈ کے ساتھ کہتی وہ گارڈ کو لئے سعدی کے کمرے کی طرف چلی آئی۔

گارڈ نے کوڈ دبائے اور دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلنے کی آواز اتنی تھی کہ اوپر اندھیرے میں چڑھتے سعدی اور خاور رک گئے۔

”اب؟“ سعدی کو ٹھنڈے پسینے آ گئے۔ خاور بھی سن ہو گیا۔

نیچے میری جیسے ہی اندر داخل ہوئی وہ گویا گنگ ہو گئی۔ کمرہ خالی تھا۔ کوئی نہیں تھا یہاں۔ اگلے ہی لمحے گارڈ زکا شور برپا ہوا۔

”کرنل خاور....“ سعدی نے لوہے کی سیڑھی نما جنگلے پکڑے گہری سانس لے کر اوپر دیکھتے کہا۔ ”زندگی ہمیں دوبارہ یہ موقع نہیں دے گی۔ اس لئے... تیز چڑھو۔“ اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ شدید خوف اور شدید پریشانی کے عالم میں بھی انسان سروائیو کر سکتا ہے اگر وہ خود ہار نہ مانے۔ ان دونوں کی رفتار میں برق روی آگئی تھی۔ وہ تیز تیز اوپر چڑھ رہے تھے۔ نیچے گارڈز پالگوں کی طرح کمرے کا ایک ایک کونہ ٹول رہے تھے۔ تبھی کسی کی نظر اوپر ذرا سے ہلے ہوئے لائٹ فلکسچر پہ پڑی۔

لفظ نشتر کی طرح دل میں اتر جاتے ہیں خط محبت کا بھی وہ لکھتا ہے تلوار کے ساتھ اسلام آباد میں اس سکس اسٹار ہوٹل کے زرد روشنیوں سے جگمگاتے شاہانہ طرز کے ڈائننگ ایریا میں ایک میز پر وہ چاروں برادرانہ تھے۔ اور بیرے ادب سے اشیائے طعام پیش کر رہے تھے۔ وہ یوں بیٹھے تھے کہ میز کے ایک طرف آبی اور ہارون تھے اور دوسری جانب وہ دونوں۔ ہارون شلوار سوٹ کے اوپر کوٹ میں ملبوس مسکرا کر آبدار سے پوچھ رہے تھے کہ اس نے اپنے مہمانوں کے سامنے اپنے والد کی شکایتیں کی ہیں یا نہیں۔ آبی بھی مسکرا کر کہہ رہی تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اس نے سرخ اسکارف کشمیری لڑکیوں کے انداز میں چہرے کے زریں لپیٹ کر پیچھے کو ڈال رکھا تھا۔ کانوں میں ایمرلڈ اور ڈائمنڈ ٹاپس دک رہے تھے۔ نیچے سفید ملائم سا سویٹر تھا جس کی ہائی نیک کے اوپر زمر کا نیکیلیس جگمگا رہا تھا۔ وہ خوش اور آسودہ لگ رہی تھی۔ بولنے کے ساتھ ساتھ مسلسل کھا رہی تھی۔

فارس ابھی تک خاموش تھا۔ چہرے پر رسمی مسکراہٹ سجائے وہ گھرے شرٹ پہ سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کبھی کبھی وہ سنہری آنکھیں اٹھا کر ہارون کو دیکھ کر مسکرا کر ان کی بات کا جواب دے دیتا، پھر سر جھکا کر پلٹ کر طرف مصروف ہو جاتا، گو کہ وہ زیادہ کھا نہیں رہا تھا۔ زمر آج دل سے تیار ہوئی تھی۔ آبی کے کورے سفید رنگ کے برعکس اس نے سلک کی سیاہ لمبی قمیض پہن رکھی تھی۔ گھنگریالے بھورے بال سامنے سے ذرا سیاچھے کر کے پن لگا کر کھلے چھوڑ دیے تھے اور بھوری آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ جب کوئی اسے مخاطب کرتا تو وہ آنکھیں ان پہ جما کر جواب دیتی اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگ جاتی۔

مصنوعی باتیں، مصنوعی روشنیاں۔

”سو فارس غازی... آپ کتنا عرصہ جیل میں رہے ہیں؟“ پران کا ٹکڑا کانٹے میں پھنساتے ہارون نے سرسری انداز میں سوال کیا۔ آبی ذرا غیر آرام دہ ہوئی مگر فارس نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔ ”آپ سے تین سال کم...“ ہارون کو اس کے جواب نے چونکا یا بھی اور محظوظ بھی کیا۔ لقمہ چباتے ہوئے مسکرا دیے۔ ”میں نے ساڑھے سات سال کی قید کاٹی ہے۔ کل ملا کر۔ تین دفعہ جیل جا چکا ہوں۔ تم ابھی مجھ سے بہت پیچھے ہو۔“ طرز مخاطب بدل دیا۔ آبدار نے آسودہ سی سانس لی۔ زمر خاموش نظر گا بے گاہے فارس اور ہارون پہ ڈال لیتی تھی۔

”آپ جہاں بھی رہے ہیں آپ اے کلاس قیدی تھے۔ میں سی کلاس قیدی تھا۔ آپ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے سر!“ آبی کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ ”آپ تو انٹیلی جنس آفیسر تھے پڑھ لکھے تھے اچھے خاندان سے تھے آپ کو تو عدالت نے اے کلاس الاٹ کرنی چاہیے تھی۔ تعلیمی خاندانی پس منظر اور جاب وغیرہ کی بنیاد پہ ہی قیدیوں کی کلاس کا تعین کرتی ہے نا عدالت۔“ اور تائیدی نظروں سے زمر کی طرف دیکھا جس نے محض سر ہلادیا۔ (جب پتہ ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہے؟)

”عدالت نے میری کلاس ”بی“ مقرر کی تھی مگر چونکہ میں ہارون عید نہیں تھا اس لئے جیل کے اندر مجھے وارڈن کی مرضی کے بلاک میں پٹا گیا تھا۔“ وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر بتا رہا تھا۔

”اور اس دفعہ؟“ ہارون نے تشویش سے پوچھا۔

”اس دفعہ میں اپنی مرضی سے سی بلاک میں گیا تھا۔“ اور مسکرا کر سر جھکا کے کانٹے سے کھانے کا ٹکڑا توڑنے لگا۔

”سو جیل کیسی ہوتی ہے؟“ آبی اب نہیں کھا رہی تھی۔ کہنیاں میز پر رکھے آگے ہو کر بیٹھی، پورے دھیان سے اس کی طرف

متوجہ تھی۔

”جیل...“ فارس نے رک کر سوچا۔ اس کے چہرے پہ تکلیف سی ابھری۔ پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر آبدار کو دیکھا تو سنہری آنکھوں

میں کرچیاں سی تھیں۔

”جیل میں آپ اکیلے ہوتے ہیں۔ کوئی آپ کا دوست نہیں ہوتا۔ کوئی آپ کا خیال نہیں کرتا۔“ اسے بہت کچھ یاد آیا۔ ”جب میں جیل میں گیا تو سب سے پہلے.... مجھے ایک کمرے میں جانا تھا۔ قراطین سے ملنے۔“

”قراطین؟“ آبی اور ہارون دونوں نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

”He means Quarantine!“ زمر نے سنجیدگی سے وضاحت کی۔ وہ بالکل چپ سی ہو گئی تھی۔ یہ سب اس کے لئے

بھی تکلیف دہ تھا۔

”مگر پاکستان میں ”کوارنٹین“ نہیں ہوتا۔ قراطین ہوتا ہے۔ جیل کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ اپنے لہجے ہوتے ہیں۔“ پھر آبی کے ہنوز الجھے چہرے کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”قراطین وہ شخص ہوتا ہے جو نئے قیدی... جس کو آپ امریکی فلموں میں ”نیوش“ کہہ کر پکارتے سنتے ہوں گی... اس نئی مچھلی کو قراطین کے پاس سے گزرنے پڑتا ہے۔ وہ اس کو اس کی کلاس اس کا بلاک اس کی بیرک اس کے ذمے مشقت سب کچھ الارٹ کرتا ہے۔ قراطین جیل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ وہ قیدی کو پہلی ملاقات میں اسے نہ مارنے کے ۲۵ ہزار لیتا ہے وہ قیدی کو ہاتھ تک نہ لگانے کے ۴۰ ہزار لیتا ہے وہ ہلکا کام دینے کے 65 ہزار لیتا ہے اور یہ رقم وہ ہر مہینے قیدیوں سے ملنے آنے والوں سے لیا کرتا ہے۔ وہ طے کرتا ہے کہ آپ کی جیل میں قسمت اور زندگی کیسی ہونے جا رہی ہے۔ اگر آپ اس کو ذرا سا بھی خفا کریں تو قراطین بادشاہ آپ کو بدنام زمانہ مجرموں کی بیرکوں میں ڈال دیتا ہے اور آپ پوری پوری رات اس خوف سے سو نہیں سکتے کہ آدھی رات کو کوئی آپ کو صرف تکلیف پہنچانے کے لئے چھرا مار جائے گا اور آپ نہ بھی مریں تو وہ تکلیف... وہ آپ کے اندر بہت کچھ ماردیتی ہے۔ اور دن کی روشنی میں تو ویسے بھی مارنے والے بہت ہوتے تھے۔“ اپنی پلیٹ کو دیکھتے ہوئے وہ کہہ جا رہا تھا ”ہر روز شام پانچ بجے قیدیوں کی چیکنگ ہوتی تھی۔ قطار میں جانوروں کی طرح کھڑا کر کے ان کا معائنہ کیا جاتا تھا۔ صرف مارنے پینے کا بہانہ تھا۔ اور کھانا...“ میز پر بھی انواع و اقسام کی ڈشز کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ زخمی مسکراہٹ۔ ”قانون کے مطابق ہر ہفتے میں تین دن چکن اور بیف لازمی ہے بریانی بھی بنے گی اور دو وقت کی چائے بھی۔ صبح ناشتے میں سبزی کی بھیجا بھی ملے گی مگر سی کلاس قیدی اگر گوشت کی شکل دیکھتے بھی تھے تو وہ برڈفلو سے مری ہوئی مرغیوں کا ہوتا تھا یا پھر ہوتا ہی نہیں تھا۔ دال اور سبزی کی بھی سب سے سستی قسم ملتی تھی کھانے میں۔ ایک احسان حکومت کرتی ہے کہ گھر کا کھانا لاؤ ڈبے، مگر میری بہن جو حلوئے اور میوئے اور کھانے میرے لئے بھیجا کرتی تھیں وہ بہت کم مجھ تک پہنچتا تھا۔ راستے میں ختم ہو جاتا تھا۔ میں ان کو منع کرتا تھا کہ وہ محنت نہ کیا کریں۔ میں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی رشوت نہ دی نہ لی لیکن یہ کام بھی جیل میں شروع کیا۔ وارڈن کو پانچ سو روپیہ فی بندہ ماہوار دو تو چار پانچ لوگ مل کر اپنا چولہا لگا سکتے ہیں اور اپنا کھانا پکا سکتے ہیں۔ جگہ جگہ پانچ پانچ لوگوں نے گروپ بنا کر یہ کام شروع کیا ہوا تھا۔ اسے ”ہانڈی وال“ کہتے تھے۔ میں بھی اس ”غیر قانونی“ اور ”رشوت انگیز“ کام میں چار سال شامل رہا۔ کیونکہ میں لنگروں والی دال اور مری ہوئی مرغی نہیں کھا سکتا تھا۔ ہمارے جیسے معاشروں میں۔ جہاں قانون نام کی کوئی چیز نہیں ہے اپنی بقاء کے لئے انسان قوانین توڑنے پہ مجبور ہو جائے اور اس کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہ ہو تو کیا یہ کرنا غلط ہوگا؟ اسی لیے اسٹہنی... احمر شفع جب کہتا ہے کہ پرزن رائٹنس ملنے چاہیے ہیں تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔“

وہ ٹھہرا اور سر جھکائے کانٹے کو پلیٹ میں پھیرا۔ میز پر مسحور کن سا سناٹا تھا۔ آبی کا گلارندہ چکا تھا اور آنکھوں میں پانی تھا۔ زمر بالکل خاموش اور سپاٹ تھی۔ ہارون نے گہری سانس لی۔

”تمہارا واقعی مجھ سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔“ وہ جیسے پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔

”مگر تم نے قراطین والی بات پوری نہیں بتائی۔ رشوت تو تم نے ہانڈی وال کو پہلی دفعہ دی تھی... تو قراطین کو کیا یاد؟“

فارس ان کو دیکھتے ہوئے زخمی سا مسکرایا۔ ”اس سے پہلی ملاقات کرنے والے خوف سے کانپ رہے ہوتے تھے وہ بادشاہ تھا ان کو

کچھ بھی کہہ سکتا تھا، ان کی عزت کا جنازہ نکال سکتا تھا۔ میرے ساتھ اس نے گفتگو میری بیوی کے نام سے شروع کی تھی۔“

آبی کا سانس رک گیا۔ ”اور آپ نے کیا کیا؟“

”میں نے اسے... مارا۔“ اپنی ابرو کی طرف اشارہ کیا۔ ”ادھر سے خون نکلنے لگا تھا اس کا۔ بارہ نالکے آنکھ کے قریب لگے تھے۔ اس نے مجھے سی کلاس میں بدنام زمانہ مجرموں کے ساتھ شفٹ کر دیا۔ تب وہ جیل میں ایک ”اعلیٰ عہدے“ پہ فائز سرکاری ملازم تھا۔ آج وہ اسی جیل میں قید ہے۔“

”اور اس کو قید کس نے کروایا؟“ آبدار نے سانس روکے پوچھا۔ وہ زخمی سا مسکرایا۔

”شاید کسی نے اپنی بیوی کے کردار پر حملہ کرنے کا انتقام لیا ہو اور صرف مارنے سے اس کا دل نہ بھرا ہو۔“ اور کندھے اچکا کر پوری توجہ سے کھانے لگا۔ آبی بے اختیار مسکرا دی۔ اسے اس لمحے فارس پہ فخر ہوا تھا۔ نگاہیں موڑ کر ہارون کو دیکھا۔ وہ بھی اس کی کمپنی سے لطف اندوز ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ آبدار کی گردن مزید اٹھ گئی۔ اس نے زمر کی طرف چہرہ پھیرا۔

”اور آپ نے ڈلوایا تھا فارس کو قید میں ہے نا؟“ بہت سادگی اور معصومیت سے اس نے زمر کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا تھا۔

لمحے بھر کے لئے اس میز پہ شدید تناؤ در آیا۔ فارس نے چونک کر پہلے آبی کو دیکھا، پھر زمر کو۔ اسے برا لگا تھا اور وہ ناگواری سے

ٹوکنے لگا تھا جب...

”آف کورس میں نے فارس کو گرفتار کروایا تھا۔“ وہ آبی کی آنکھوں پہ نظریں جمائے، مسکرا کر بولی تھی۔ ”کیونکہ مس عبید میں نے ساری زندگی لوگوں کو انصاف دلوانے کے لئے جدوجہد کی ہے۔ اگر میرے اپنے خاندان میں میرے وژن آف ٹرو تھ کے مطابق، کوئی شخص مجرم ہے تو میں انصاف کے حصول کے لئے اس کے خلاف بھی کھڑی ہوں گی اور قانون کی پوری مدد کروں گی۔ کیا آپ ایسا کر سکتی ہیں؟“ گردن اٹھا کر وہ ہموار مگر فخریہ لہجے میں بولی تھی۔ (دل پہ جو گزری سو گزری)

آبدار کا چہرہ پھیکا پڑ گیا، اس نے بمشکل تھوک نگلا۔ ہارون نے بھی تنبیہی نظروں سے اسے گھورا۔

”شاید میں ایسا نہ کر سکتی۔ آئی ایم سوری۔ میں نے سنا تھا آپ نے سعدی یوسف کے میموریل ڈنر پہ کہا تھا...“ (ہارون نے غیر آرام دہ پہلو بدلا) ”کہ آپ کے بھتیجے نے آپ کو اپنا گردہ ڈونٹ کیا تھا۔ یہ سب بہت مشکل ہوگا آپ کے لئے... اس کا کھوجانا...“ وہ اب سخت الفاظ کا اثر زائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

زمر نے گہری سانس لی۔ ”مجھے نہیں پتہ وہ کہاں ہے، مگر مجھے امید ہے کہ وہ زندہ ہے۔ ان آٹھ ماہ میں میں چند لمحوں کے لئے بھی اپنا فون آف نہیں کرتی، اس ڈر سے کہ وہ کال کرے گا اور اگر میں نے نہ اٹھایا تو کیا ہوگا؟ کیونکہ مجھے پتہ ہے وہ سب سے پہلے مجھے کال کرے گا۔“

میز پہ خاموشی کا دورانیہ بڑھ گیا، پھر ہارون نے ہمدردی اور اپنائیت سے پوچھا۔ ”وہ کس طرح کا انسان تھا؟“

”مہربان، نرم دل اور...“ زمر کہنے لگی، مگر فارس نے چہرہ اٹھا کر اطمینان سے کہا۔ ”فریب کار۔“

سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ اب وہ سر جھکا کر پلیٹ میں چھری کا ثنا چلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”اس نے اپنے خاندان کے ہر فرد کو یہ یقین دلارکھا تھا کہ سب سے زیادہ محبت وہ اسی سے تو کرتا ہے، راز دار بھی وہ اسی کا ہے، اور سب سے بڑی قربانی وہ اسی کے لئے دے گا۔ جب وہ نہیں رہا، تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہم میں ہر شخص ہی خود کو سعدی کا سب سے اچھا دوست سمجھتا ہے۔ ایسے شخص کو آپ فریب کار نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے۔“

زمر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، مگر اس نے کمال ضبط سے ان کو اندر اتار لیا۔ اس نے فارس سے سعدی کا ذکر بہت کم سنا تھا، اور اس

طرح تو شاید پہلی دفعہ، مگر پہلے کب وہ اسے بولنے کا موقع دیتی تھی؟

”فارس غازی!“ ہارون نے بہت امید سے اسے دیکھ کر کہا۔ ”میرے لئے کام کرو!“

”میں جاب انٹرویو چائے نہیں دیا کرتا“ اور آپ سے اتنے اچھے دوستانہ ماحول میں ملاقات کرنے کے بعد میں آپ کے لئے کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ دوستوں کے ساتھ کاروبار نہیں کیا جاتا۔“

”اگر تم سیاستدان ہوتے تو اتنی جیل کاٹ کروٹ ملتے، سیاستدان نہیں ہو اس لئے اب نوکری تک ملنا مشکل ہوگی۔ نوکری کے بغیر تمہارا کیا بنے گا؟“ وہ سمجھانے والے انداز میں کہہ رہے تھے۔ فارس بند ہونٹوں سے لقمہ چباتے ہوئے مسکرایا اور ذرا آگے کو جھک کر ہارون کی آنکھوں میں دیکھا۔

”آپ ایک بے گناہ آدمی کو ایک بدنام زمانہ جیل کے سی بلاک میں بے رحم اور خطرناک دہشت گردوں، اسمگلرز اور قاتلوں کے ساتھ چار سال کے لئے بند کر دیں اور اگر وہ سوائیو کر جائے تو کیا اس کے کچھ بن جانے میں آپ کو شک ہونا چاہیے؟“

بہت عرصے بعد ہارون کو کسی نے اتنا محظوظ کیا تھا۔ مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ ”میری پیشکش تمہاری میز پر دھری ہے۔ مجھے جواب کا انتظار رہے گا۔“ آبی بھی تائیدی انداز میں مسکرائی۔ اور زمر کو پتہ نہیں کیا، مگر کچھ بہت برا لگ رہا تھا۔



تم بڑے لوگ ہو سیدھے ہی گزر جاتے ہو ورنہ کچھ تنگ سی گلیاں بھی ہیں بازار کے ساتھ کولمبو پہ شام کی تاریکی پوری طرح چھا چکی تھی۔ شہر کی چمچاتی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ اسٹریٹ پہ منتظر کھڑے تماشا بینوں کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسے میں تاریک ایلٹی ویٹر shaft میں وہ کافی اوپر چڑھ آئے تھے اور نیچے لوہے کی چادر کو سلسل توڑنے، کانٹے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چند گارڈز اوپر بھی دوڑے تھے، کہیں تو کھلتی ہوگی وہ شافٹ۔ مگر ہوٹل کے نقشوں پہ وہ بنی ہی نہیں تھی۔

تیسری منزل پہ رک کر خاور نے دیوار پہ دستک دی۔ رجم میں... تین دفعہ۔ وہاں چوکور سا کارڈ بورڈ لگا تھا۔ اگلے ہی لمحے کارڈ بورڈ اندر سلائیڈ ہوا اور روشنی نظر آئی۔ آگے ایک کھلی ہوئی الماری تھی۔ وہ دونوں یکے بعد دیگرے الماری کے اندر سے ہو کر اس کمرے میں آ کھڑے ہوئے۔ اتنے عرصے بعد... سعدی یوسف نے کوئی اور کمرہ دیکھا تھا۔ روشن اور ہوادار... مگر اس نے ضبط نہیں کھویا۔ سنبھلا ہوا محتاط کھڑا رہا۔

سامنے کچن کا ہیڈ شیف کھڑا تھا۔ ان کو اندر لا کر اس نے جلدی سے کارڈ بورڈ برابر کیا۔ اور الماری سے ایک بیگ نکال کر خاور کو تھمایا اور الماری کو لاگ کیا۔

”سو تمہیں ہمارے... مطلب کرنل خاور کے پیغامات ملتے رہے تھے؟“ سعدی نے خاور کو بیگ کی زپ کھول کر اندر تمام چیزوں کی تلی کرتے دیکھا تو شیف کو مخاطب کیا۔

خاور سینڈ ویج کے ریپر پہ کونے میں الفاظ لکھتا تھا۔ اور مردوڑ تروڑ کر پلیٹ میں رکھ دیتا۔ سارا کوڑا میری بن میں پھینک دیتی۔ روز شام کو گارڈز کوڑا اوپر کچن میں جا کر ڈال دیتے۔ شیف ایک ایک ریپر چیک کرتا تھا۔ یقیناً اس کو پیغام ملے تھے۔

”کرنل خاور کے مجھ پہ احسان ہیں۔ میں ان کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ تمہارے لئے نہیں۔“ درز دیدہ نظروں سے سعدی کو خشک لہجے میں کہا اور کپڑوں کا پیکٹ تھمایا۔ وہ بھی بس اس کو گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ خاور اب اس کے شانے کو تھپک کر اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا....

نیچے لابی میں ہاشم کا ردار ہنوز صوفے پہ بیٹھا، میبلز کا جواب دے رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ گھڑی پہ بھی نظر ڈال لیتا۔ پراہرا (پریڈ) کے اس اسٹریٹ تک پہنچنے میں کم وقت رہ گیا تھا....

اوپر تیسری منزل کی لفٹ کے دروازے کھلے اور اندر خاور اور سعدی کھڑے نظر آئے۔ سیاہ پیٹٹ سفید شرٹ اور سیاہ کوٹ پہنے ماتھے پہ ویٹرز کی مخصوص ٹوپی سجائے وہ دونوں باہر نکلے۔

”سی سی ٹی وی ریواسنڈ ہو چکے ہیں کنٹرول روم میں کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکتا، بس کسی شناسا گارڈ سے نہ نکرانا۔“ خاور اس کو ہدایت دے کر راہداری میں ایک طرف کوچلا گیا اور سعدی سر ہلا کر ٹرائی دھکیلتا ہوا دوسری طرف چلتا گیا۔

نیچے بیٹھے مصروف سے ہاشم کی طرف دو گارڈز تیز تیز چلتے آئے تو رئیس الرٹ سا ہوا۔ ہاشم کو پکارا۔ اس نے چہرہ اٹھایا اور ان دونوں کے چہروں پہ اڑتی ہوئیاں دیکھ کر وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ تیز تیز گھبراہٹ سے اسے کچھ بتا رہے تھے اور ہاشم کے چہرے کی رنگت متغیر ہو رہی تھی۔ پھر وہ بے اختیار آگے کو بھاگا۔۔۔

سعدی یوسف سر جھکائے ٹرائی دھکیلتے... راہداری کے موڑ پہ آنکھرا۔ گردن نکال کر اگلی راہداری میں جھانکا۔ ایک کمرے کے بند دروازے کے باہر دو مستعد گارڈز کھڑے نظر آئے۔ سعدی نے جیب سے شوپاش کی ڈبی جتنی شے نکالی پھر سانس روک کر اس کا ڈھکن گھمایا اور جھک کر زمین پہ آگے کو لڑھکا دیا۔ وہ گارڈز کے قریب بنا آواز کے چلتی گئی اور جاتھری۔ اس میں سے بغیر رنگ کی ہوا نکلنے لگی۔ اوٹ میں کھڑے ناک پہ رومال رکھے سعدی دھڑکتے دل سے گھڑی دیکھنے لگا۔ ایک منٹ... دو... ساڑھے تین منٹ بعد اس نے گردن نکال کر جھانکا۔

گارڈز زمین پہ لڑھک چکے تھے۔ بے حس اور بے سدھ۔ وہ ٹرائی دھکیلتا تیزی سے آگے آیا اور مخالف دروازے کے سامنے ٹھہرا۔ دوسری جیب سے ماسٹر کی کارڈ نکال کر دروازے میں لگایا۔ دروازہ کھولا اور ان دونوں کو گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں لا ڈالا۔ پھر ان کو وہاں لاک کر کے اس کمرے تک پہنچا جہاں وہ پہرہ دے رہے تھے۔ ابھی وہ دروازے کے قریب کارڈ لے کر گیا تھا کہ...

p¹ p² savan مخالف سمت سے ایک اسی حلیے والا ویٹر آتا دکھائی دیا اور قدرے خفگی سے سنہالی زبان میں اسے مخاطب کیا۔ سعدی بالکل منجمد ہو گیا۔ پھر ہلکا سا چہرہ موڑا۔

”savan! ehidi tuva ve?“ پھر ذرا جینجھے سے اسے دیکھا۔

”oba alut?“ (کیا تم نئے ہو؟) وہ ایک انجان زبان میں سعدی یوسف سے بات کر رہا تھا اور وہ جواب مانگ رہا تھا۔ سعدی نے گہری سانس لی۔

”mama danne nae. oba ahanna.“ (مجھے نہیں معلوم۔ نیچے جا کر خود معلوم کر لو۔) اور رخ موڑ کر ٹرائی میں چیزیں درست کرنے لگا۔ ویٹر بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا اور سعدی یوسف نے دل میں اس دن کے لئے شکریہ ادا کیا جب اس نے فارس غازی کے پیغام پہ عمل کر کے خاور کو اپنا صاحب لہجہ بنایا تھا۔ گزارے لائق سنہالی صرف وہی اس کو سکھا سکتا تھا۔

گارڈ لگا کر اس نے دروازہ دھکیلا۔ اندر ایک پر تعیش اور شابانہ طرز میں سجا سوئیٹ روشن سا نظر آ رہا تھا۔ ایک بیوٹیشن کھڑی سونیا کے بال بنا رہی تھی۔

”وہ تمہیں نیچے بلارہے ہیں کب سے کال کر رہا ہوں۔ جلدی جاؤ سر غصے میں ہیں۔“ وہ کوئی انجان مگر غیر ملکی لڑکی تھی اس کو انگریزی میں ڈپٹا تو قدرے پریشان ہو گئی اور جلدی سے باہر کو بھاگی۔ سونیا نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ سعدی فوراً پلٹ گیا۔ جب لڑکی باہر نکل گئی تو اس نے دروازہ بند کیا اور ٹوپی اتارتے ہوئے آہستہ سے سونیا کی طرف گھوما۔

”ہیلو پرنس!“ مسکرا کر کہتے وہ قریب آیا۔ سونیا کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ معصوم چہرے پہ حیرانی اور الجھن ابھری۔ خوبصورت آنکھیں سکیڑیں۔

”سعدی!“ وہ پہچان کر اسٹنول سے اٹھی۔ سرخ لمبی میکسی میں وہ بالوں کی چوٹی بنائے بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔
 ”تم تو... چلے گئے تھے۔“ اپنی عمر کے لحاظ سے وہ صرف اتنی حیران ہو سکتی تھی۔

وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آ بیٹھا اور نرمی سے اس کے دونوں ہاتھ تھامے۔
 ”مگر میں واپس آ گیا ہوں، سونی کے ساتھ ایک گیم کھیلنے۔ یاد ہے جب میں تمہاری می سے ملنے آیا تھا جب تم دونوں فلم دیکھ رہے تھے مال میں اور پھر میں نے تمہارے ساتھ ایک گیم کھیلا تھا؟“
 سونیا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ شرارت سے مسکرائی۔ ”آئی نو۔“

”سو... سونیا...“ مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ بولا ”Do you wanna build a snowman“
 اور سونیا کھلکھلا کر ہنس دی۔ گردن پیچھے پھینک کر۔ دل کھول کر۔ اس کو یہ فقرہ جیسے گدگد دیتا تھا...

نیچے تہ خانے کے دروازے کھلے پڑے تھے اور ہاشم وسط میں کھڑا سرخ چہرے کے ساتھ گارڈز پہ غرار ہاتھ چنچ رہا تھا۔ ”وہ کہاں
 ہلتے ہیں۔ ڈھونڈو! ان کو۔ وہ ہوٹل میں ہوں گے۔ نریکر سے ڈھونڈو۔“

ارد گرد افراتفری مچی تھی۔ گارڈز آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ رئیس کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا کھٹ کھٹ ٹائپ کر رہا تھا۔
 تبھی ہاشم کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے جھلا کر دیکھا۔ ایک نئی ویڈیو موصول ہوئی تھی۔ سونی کے نیپلیٹ سے۔ وہ بھر گیا اور
 اب اس پہ کلک کیا... تو منظر سونی کے کمرے کا تھا۔ وہ وسط کمرے میں تیار کھڑی تھی دونوں ہاتھ مخصوص رخ پہ اٹھائے منہ ذرا کھولے آنکھیں
 بند کیے وہ ساکت کھڑی تھی۔ جیسے برف کا مجسمہ ہو۔ (ہاشم گویا خود برف بنتا گیا) کیمرہ ایک طرف کو پھین ہوا اور سعدی کا چہرہ... صرف چہرہ
 اٹھائی دیا۔

”گڈ ایوننگ ہاشم! کاردار۔ سونیا اور میں بہت انجوائے کر رہے ہیں۔ سونیا اس وقت سونیا نہیں ہے۔ وہ ”اولف“ ہے اور فریز ہو چکی
 ہے۔ اور بابا کو اتنا تو معلوم ہوگا کہ صرف سچی محبت سے کیا گیا عمل ایک جیسے دل کو پگھلا سکتا ہے“ ہے نا اولف؟“ اس نے رک کر سونیا کو دیکھا۔ وہ
 بند آنکھوں سے مسکراہٹ دبائے سر کو ذرا سا خم دے کر رہ گئی، اس سے زیادہ وہ نہیں بل سکتی تھی۔ کیمرہ واپس سعدی کے اوپر ہوا۔ وہ اب اٹھ کر
 سونی کے عقب میں آ کھڑا ہوا۔ ”میں سونی کے روم میں ہوں۔ اور میرے پاس باہر کھڑے گارڈز کے ٹوائز بھی ہیں۔“ ہاتھ لہرا کر بریٹا پستول
 اٹھایا۔ ”اور میں پہلے بھی ایک گارڈ کو اس کے گرینڈ چیئرمین تک پہنچا چکا ہوں، سو میری صلاحیتوں پہ تمہیں شک تو نہیں ہونا چاہیے۔ اب دیکھنا یہ
 ہے کہ سونی کے بابا سونی کے لئے... سوری اولف کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ میرے سارے لیگل ڈاکومنٹس لے کر اس کمرے میں آ جائیں اور
 مجھے یہاں سے بخیریت نکلنے دیں، تو میں سونی کو پگھلا دوں گا ورنہ... سونی... ہار جائے گی!“ اور ویڈیو یو بند ہو گئی۔

زندگی میں پہلی بار... ہاشم کاردار کو اپنا سر اٹھانے لگا... اپنی ساری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس کی رنگت پہلے سفید پڑی اور پھر
 سرخ۔ بوکھلا کر اس نے چہرہ اٹھایا۔ ”وہ میری بیٹی کے کمرے میں ہے۔“

تب تک کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا رئیس بھی بول اٹھا تھا۔ ”وہ واقعی اسی فلور پہ ہے۔ وسط میں... یقیناً مس سونیا کے کمرے میں۔ اس
 نے کندھے کے اندر لگا ٹریکر میں نے ایکٹیویٹ کر دیا ہے۔ وہ اب بچ کر نہیں جاسکتا۔“

”اور خاور... وہ کہاں ہے؟“ وہ زور سے چلایا تھا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس نے آستین سے ترپیشانی پونجھی۔ دماغ
 ابھی تک گھوم رہا تھا۔

”وہ بھی وہیں ہے۔“

”اس نے اپنے پیپر زمانگے ہیں۔ میں ادھر جا رہا ہوں۔ میرے پیچھے پانچ آدمی میری بیٹی کے کمرے کی طرف بھیجے۔ تم دونوں

کمرے کی پچھلی طرف سے آؤ۔ اور رئیس...“ وہ تیز تیز ہدایات دے رہا تھا۔ ”اسنا پیرز کو بلواؤ“ وہ چھت پہ بیٹھ کر بیرونی دروازوں کو تاک میں رکھیں گے۔ سادہ کپڑوں میں گاڑڈ کو ہوٹل کے چاروں طرف بکھیر دو۔ وہ دونوں زندہ یہاں سے نہیں نکلیں گے۔“ دانت پیس کر غصے سے کہتا وہ باہر کی طرف بھاگا۔ دو گاڑڈ اس کے ساتھ دوڑے تھے۔

وہ لفٹ میں تھا جب فون بجا۔ سونیا کے نمبر سے کال آ رہی تھی۔ اس نے تیزی سے فون کان سے لگایا۔ ”اگر تم نے میری بیٹی کو نہ ہارا بھی، تو میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔“ لال بھبھو کا چہرے کے ساتھ وہ چیخا تھا۔

”گڈ ایوننگ ہاشم! کیسے ہو۔ مجھے بھی تم سے بات کر کے اچھا لگا۔ موسم کیسا ہے؟“

”سونیا سے بات کرو! تم سن نہیں رہے میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ تیز تیز تنفس کے دوران بانپٹا کا پتا وہ پھر غرایا تھا۔

”وہ تو بات نہیں کر سکتی۔ وہ فروزن ہے۔ کیا فلم ہے ویسے۔ کبھی ہمیں دوبارہ اکٹھے بیٹھ کر دیکھنی چاہیے۔“

”سعدی!“ لفٹ کے دروازے کھلے تو وہ باہر نکلا۔ چند گہرے سانس لے کر خود پہ قابو پایا۔ ”میں تمہارے ڈاکو منٹس لے آؤں گا“ تمہیں جانے دوں گا“ تم میری بیٹی کو کمرے سے باہر نکالو، خود بے شک کمرہ بند کر کے بیٹھے رہو میں تمہارے ساتھ پورا تعاون کروں گا“ مگر اسے جانے دو۔“

”مر نہ جاتے خوشی سے اگر اعتبار ہوتا۔“ وہ گنگنایا تھا۔

”تم اتنا نیچے کیسے گر سکتے ہو؟ وہ ایک معصوم بچی ہے۔ کوئی انسانیت، کوئی اخلاقیات باقی ہیں تمہارے اندر یا ایک قتل کرنے کے بعد تم ان سے بھی گزر چکے ہو؟“ وہ افسوس اور بے یقینی سے کہہ رہا تھا۔

”کوئی گھنٹی بجی ہاشم کا ردار؟ یاد ہے وہ دن جب مجھے بے بس کر کے تم میری بہن کے بارے میں بات کر رہے تھے؟ میری بھی بہن حالت ہوئی تھی۔“ الفاظ کے برعکس اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ہاشم نے پیشانی کو مسلتے ہوئے بمشکل خود پہ قابو کیا۔

”اچھا میں کمرے کے باہر ہوں۔ بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟“ دروازے کے سامنے کھڑے اس نے فکر مندی سے ادھر ادھر دیکھا۔ ”تعدہ گاڑڈ اپنی گن نکالے، جو کس کھڑے تھے۔“

”میرے تمام لیگل ڈاکو منٹس جن کی مدد سے میں واپس جا سکوں۔“

”میں نے منگوائے ہیں، چند منٹ لگیں گے۔ تم مجھے اندر آنے دو۔“ کہہ کر اس نے دروازہ بجایا۔ لاک گھمایا۔ وہ بند تھا۔ ہیجک آلی بھی بند تھی۔ وہ اندر جھانک بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ پاگل ہو رہا تھا۔ ”سعدی، دروازہ کھولو۔“ اس نے زور سے بجایا۔

”اگر تم نے ایک دفعہ پھر دروازے کو ہاتھ بھی لگایا تو میں اس کی جان لے لوں گا۔ دروازہ صرف تب کھلے گا جب تم ڈاکو منٹس ۱۱ گئے اور سنو، تم اکیلے آؤ گے۔“

”ہاں“ میں اکیلا آؤں گا۔ مجھے پانچ منٹ دو۔“ وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا تھا۔ دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔ ہاشم اب رئیس کو کال کر کے اسے جلدی وہ کاغذات اوپر بھیجنے کو کہہ رہا تھا۔ ایک خاکی لفافے میں چند ردی کاغذ۔ وہ یہ دکھا کر سعدی کو کم از کم دروازہ کھولنے پہ مجبور کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ دروازہ کھل گیا تو اسکے بہترین مارکس مین ان دفناریوں کو سنبھال لیں گے۔

جب تک ایک گاڑڈ اوپر آیا وہ لفافہ لے کر جس میں رئیس کا پاسپورٹ اور چند ردی کاغذ تھے۔ اس کمرے کو دونوں اطراف سے ہمراہ جا چکا تھا۔ ہاشم کا ردار کی آدھی نفری وہاں موجود تھی۔ کچھ لوگ بالکونی میں اتر آئے تھے کچھ بندوقیں سنبھالے راہداری میں کھڑے تھے۔ ہاشم نے لفافہ پکڑا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب نہ دار۔ اس نے گاڑڈ سے ماسٹر کی کارڈ لیا اور دروازے میں لگایا۔ دروازہ کھل گیا۔

”سعدی! میں تمہارا پیپر لے آیا ہوں۔“ اس نے احتیاط سے کہتے ہوئے دروازہ دھکیلا۔

وہ سنتی رہی۔ پھر تکان سے مسکرائی، اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابا کی بات مکمل ہوئی، اور اس کی واک۔ والہیسی کا سفر خاموشی سے کٹا۔ ابا نے پھر کچھ نہیں کہا۔ وہ کہہ کر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ پیچھے پڑ جانا اور با بار دہرانا، اولاد کو ڈھیٹ بناتا ہے، اور ابا ایسا نہیں چاہتے تھے۔



ایک ضرب اور بھی اے زندگی تیشہ بدست سانس لینے کی سکت اب بھی مری جان میں ہے
اگلی صبح فارس غازی نے کاردار اینڈ سنز کے ہیڈ آفس میں ہاشم اور جواہرات کی موجودگی میں سائن کیے۔ اٹھ کر ان سے باری باری ہاتھ ملایا اور چند مصنوعی مبارکبادیں، اور نیک تمناؤں سن کر وہ وہاں سے چلا آیا۔ اس کے جانے کے بعد جواہرات نے ہاشم کو دیکھا۔
”وہ کراچی جانے کی بات کر رہا تھا۔ کیا واقعی وہ ہماری زندگیوں سے چلا جائے گا ہاشم!“
”اب موآن کرنے کا وقت ہے مئی۔ ماضی کو ماضی میں چھوڑ کر نئی زندگی شروع کرنے کا وقت ہے۔ اس کو اس کی زندگی شروع کرنے دیں۔ جیل نے اسے سارے سبق سکھا دیے ہیں۔ اب وہ انتقام اور انصاف کے چکروں سے دور ہے گا۔“ وہ کافی مطمئن لگ رہا تھا۔
میز پر انیکسی کی چابی رکھی تھی۔ جو گڈول جیمپر کے طور پر فارس ادھر چھوڑ آیا تھا۔ یہ انیکسی ان کی ضد تھی، اور وہ اورنگزیب کا ردِ کار کی وجہ سے اتنے سال خاموش رہے تھے۔ پھر برے بھی نہیں بننا چاہتے تھے۔ اور اب... وہ ان کی جھولی میں آگری تھی۔ کیا شاندار آغاز تھی زندگی کا۔
”پراہراپہ جانے کی تیاری کریں مئی!“ وہ سکون سے بولا تھا۔ شیر اور سعدی کے معاملے ذہن سے ہٹا کر وہ پراہراپہ انجوائے کرنا چاہتا تھا۔

سری لنکا میں تین بڑے پراہرا (پریڈ) ہوتے تھے۔ تینوں ”پویا“ یعنی ماہِ کامل (پورے چاند) کی راتوں کو ہوتے تھے۔ پہلا جنوری میں ہوتا تھا۔ دوسرا فروری اور تیسرا جولائی میں۔ پجاری اور ہاتھیوں کا لشکر مندر سے شروع ہوتا اور شہر کی مختلف گلیوں کا چکر کاٹ کر اپنی منزل تک پہنچتا تھا۔ پورا شہر، اور پوری دنیا سے لوگ آ کر فٹ پاتھ پہ گھنٹوں کھڑے ہو کر پریڈ کے ان کی گلی تک پہنچنے کا انتظار کرتے تھے اور پھر اس کو گزرتے دیکھتے تھے۔ کاردار زکولمبو کا ایک پراہرا ہمیشہ دیکھنے جاتے تھے۔ شہرین پہلے ساتھ جاتی تھی لیکن اب ہاشم اس کو نہیں لے کر جا رہا تھا۔ شیر و اس نے پوچھا تک نہیں۔ سونی کی جان تھی ان ہاتھیوں میں۔ وہ اس کو لے جا رہا تھا جواہرات کے ساتھ، اور وہ مطمئن تھا۔
ماہِ کامل کی رات سے دو روز پہلے گارڈز سعدی اور خاور کو ان کے کمروں سے نکال کر لائے، اور ایک تیسرے کمرے کے دھاتی دروازے کھولے، جو صرف بجلی سے کھلتے تھے، اور ان کو اندر دھکیلا۔ وہ اس کپاؤنڈ کا میکسیکیم سکیورٹی روم تھا۔ اندر دو لوہے کے پلنگ رکھے تھے۔

”بہت جلد تم لوگوں کو اس جگہ سے منتقل کیا جا رہا ہے۔ تب تک تم ادھر رہو گے۔“ حیران سے سعدی کو بتایا گیا تو وہ فوراً خاموش کھڑی میری کو دیکھنے لگا، جیسے بہت شاکڈ ہوا ہو۔

”تم نے بتا دیا ان کو؟“ میری نے نگاہیں جھکا دیں۔ خاور نے غصے سے سعدی کو دیکھا۔ ”تم نے اسے کیوں بتایا؟“
”میں سمجھا وہ بھی جانا چاہے گی۔ میری تم ایسے کیسے کر سکتی ہو؟“ وہ بے حد ہٹ لگتا تھا۔ میری خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اس نے اپنے کان کو یا پلیٹ لئے تھے۔ جب دروازے قفل در قفل بند ہوتے گئے اور وہ دونوں تنہا رہ گئے تو سعدی اس کی طرف گھوما۔ ”تمہیں یقین ہے ہماری باتیں ریکارڈ نہیں ہو رہی؟“

”کوئی بھی اپنی ذاتی جیل میں کیمرے، ریکارڈر یا سر ویلنس نہیں لگا تا سعدی، آپ کو کیا معلوم ڈی وی آر پہ بیٹھا گاڑ بک جائے اور وہ ویڈیوز جو آپ کے خلاف ڈیجیٹل وارنٹ ہیں، جا کر پولیس کو دے دے۔ پھر بھی مجھے چیک کرنے دو۔“
خاور کام پہ لگ گیا۔ دیواروں کو چھو کر... ٹنول کر محسوس کیا۔ کوئے چیک کیے۔ پھر پلنگ کھینچ کر چڑھا اور چھت کا معائنہ کرنے لگا۔

سو ہاتھیوں کو قافلے اس وقت سڑک سے گزرتا تھا۔

ہاشم نے ایک دم چونک کر سر اٹھایا۔ اس کے اوپر جیسے کوئی انکشاف ہوا تھا۔

”پراہرا۔ وہ پراہرا کے ہجوم میں گم ہونے والے ہیں۔“ پھر تیزی سے مڑا۔ ”سڑک پہ جاؤ۔ اسٹریٹ میں پھیل جاؤ۔ وہ نظر آ جائیں گے۔“ موبائل بجاتو اس نے تیزی سے کال اٹھائی۔ دوسری طرف رئیس تھا۔

”سر سونی کا فون باہر کی طرف جارہا ہے... باہر پراہرا کی طرف۔ میں بھی ادھر جا رہا ہوں۔“ رئیس دوسرے ہاتھ میں ٹیب پکڑے ان کی لوکیشن کو سامنے رکھے بھاگتا ہوا پکین سے نکل رہا تھا۔

ہاشم اب اوپر کھڑا اپنے گارڈز کو چلا کر ہدایات دے رہا تھا۔ چھت پہ موجود اسنا پرتیار تھے۔ جیسے ہی ان کو سعدی یا خاور دکھائی دیں وہ ان کو گولی مار دیں گے۔

چند ہی منٹوں میں گارڈز پوری اسٹریٹ پہ پھیل گئے تھے۔ ایک ایک کو دیکھتے وہ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

ایسے میں رئیس ٹیب پہ لوکیشن کو سامنے رکھے دوڑتا ہوا باہر آیا تھا۔ دائیں بائیں گردن گھماتا وہ سیاحوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھنے لگا مگر راستہ نہیں مل رہا تھا۔ بمشکل لوگوں کو پرے ہٹاتا دھکے دیتا معذرتیں کرتا وہ آگے آیا۔ موبائل ٹریکر کا سرخ نشان ایک جگہ رک گیا تھا۔

وہ بدقت اس جگہ پہنچ پایا۔ سیاحوں کی خفگی اور ڈانٹ پھٹکار کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے ٹیب کو دیکھا۔ سرخ دائرہ (سونی کا فون) سبز دائرے (خود رئیس) کے ساتھ کھڑا تھا۔ پھر وہ دائیں طرف مڑنے لگا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ سامنے ایک یورپین خدوخال کی سنہرے بالوں والی بچی دائیں طرف جا رہی تھی۔ وہ آندھی طوفان کی طرح اس کے سر پہ پہنچا۔ اسکی ہڈی والی سویٹر کا ہڈ پیچھے کو گرا ہوا تھا اور کمر پہ پہنے بیک میں ٹیب رکھا تھا۔

”لغت ہے۔“ اس نے ٹیب اٹھا کر بدحواسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف انسانوں کا سمندر بکھرا تھا اور اس سب میں ان دونوں کا کوئی نام و نشان تک نہ تھا۔

وہ دوڑتے قدموں سے اوپر ہاشم کے پاس آیا تھا۔ وہ وہیں کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔

”سر... پھو... تنفس کے دوران اس نے کہا۔“ وہ نہیں ہیں۔ یہ فون انہوں نے پراہرا دیکھنے والی ایک بچی کے اوپر پلانٹ کر دیا اور خود رش میں آگے نکل گئے۔“

”ہیں لوگ سڑک پہ پھیلے ہو اور کسی سے وہ دو لوگ نہیں پکڑے گئے۔“ وہ دھاڑا تھا۔ بار بار آستین سے پیشانی پونچھتا۔ دل چاہ رہا تھا اس کو شوٹ کر دے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اتنی جلدی نکل گئے ہوں اور تمہیں نظر ہی نہ آئے ہوں؟ سلیمانی چغے پہن رکھے تھے انہوں نے یا...“ ہاشم رکا۔ ایک دم سے اس کے اوپر ڈھیر ساری ٹھنڈی برف گر گئی تھی۔ آہستہ سے اس نے گردن موڑی اور نیچے سڑک پہ بہتے پراہرا کو دیکھا۔ سیاحوں کے رش کو دیکھا۔ ہاتھیوں کو دیکھا۔

”نہیں... ہم غلط تھے... پراہرا... پریڈ صرف ڈسٹرکشن ہے۔ ہمارا دھیان بٹانے کے لئے... وہ پراہرا کے ہجوم میں گم ہو کر نہیں نکلنے والے تھے۔“ چونک کر ان لوگوں کو باری باری دیکھا۔ ”کیا اس ہوٹل سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟“

رئیس نے سوالیہ نظروں سے گرے کوٹ والے گارڈ کو دیکھا جو ہوٹل کی سکیورٹی میں سے تھا۔ اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں سر“ دروازوں کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔“ پیچھے کھڑا شیف خاموشی سے ان کو دیکھتا رہا۔

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے

”کارا!“ ہاشم شعلہ بار نظروں سے اسے گھورتا دو قدم آگے آیا۔ ”میں ابھی تک ایسے کمرشل سے نہیں ملا جو ایک عظیم الشان ہوٹل بنائے اس کے تہ خانے میں ذاتی جیل رکھے اور پھر پولیس کے اچانک ریڈ سے بچنے کے لئے کوئی خفیہ راستہ نہ رکھے۔ مجھے بتاؤ... کوئی... اور... راستہ ہے یا نہیں؟“

”سر آپ میرا یقین کریں یہاں پہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ ہوتا تو میں آپ کو پہلے بتاتا۔ پہلے یہاں پہ مین ہولز تھے مگر بعد میں ان کے اوپر سروسز باتھر رومز بن گئے تو وہ بھی بند ہو گئے اور...“

ہاشم نے پوری قوت سے اس کے جڑے پہ مکا دے مارا۔ وہ پیچھے کولڑھک گیا۔ دیوار کا سہارا لیا اور گرتے گرتے بچا۔ ”ان کے پاس کمروں کے ماسٹر کی کارڈز ہیں بے ہوش کرنے والی گیس ہے اسلحہ ہے ہوٹل کی وردی ہے کوئی اندر سے ان کی مدد کر رہا ہے۔ اور تمہارے جیسے گدھے کا خیال ہے کہ ان کے مددگار فرش کی چند اینٹیں اکھاڑ کر ان کے لئے مین ہول کھول کر نہیں رکھیں گے؟“ وہ چیخا تھا۔ جس کے منہ پہ لگی تھی وہ خون آلود منہ پہ ہاتھ رکھے سر جھکائے سیدھا اٹھ کھڑا ہوا۔

”کدھر ہیں مین ہولز؟ لے کر چلو مجھے ادھر۔“ ایک دفعہ پھر گاؤڑ کی دوڑیں لگ گئی تھیں۔

باتھر رومز ایریا میں اسے مین ہول کی جگہ کا پتہ لگانے کے لئے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں تھی۔ کونے والا باتھر روم بند تھا اور اس کے اوپر ”خراب ہے“ کا سائن صاف نظر آ رہا تھا۔

”سریہ کل سے لیک ہو رہا تھا“ آج بھی ٹھیک نہیں ہو سکا۔...“ ہیڈ آف سکیورٹی اس کا دروازہ کھولنے لگا تو وہ اندر سے لاکڈ تھا۔ ہاشم نے اسے پرے دھکیلا، اور بوٹ سے دروازے پہ ٹھوکر ماری۔ ایک دو... اور دروازہ اڑتا ہوا دوسری طرف جا لگا۔

اندر فرش کے کونے میں اتنی جگہ اکھڑی پڑی تھی کہ ایک آدمی نیچے اتر سکے۔ نیچے تیس فٹ کی اترائی تھی اور اس کے نیچے لمبی سرنگ۔ ہاشم آگے آیا اور اس مین ہول کے دہانے پہ کھڑے ہو کر گردن جھکائے اندر کو جھانکا۔ اوپر ایک ٹائل تلے ایک کاغذ رکھا تھا۔ ہاشم نے جھپٹ کر اسے اٹھایا اور چہرے کے قریب لایا۔

Everyone's bit of a fixer upper!

وہ سعدی کی لکھائی لاکھوں میں پہچانتا تھا۔ غصے سے مروڑ کر کاغذ پرے پھینکا۔ گاؤڑ اور رئیس باہر کو بھاگے تھے۔ کچھ لوگ اندر اتر رہے تھے۔ کچھ باہر سے اس کے دوسرے دہانے تک جا رہے تھے۔ مگر ہاشم کا رد ار جانتا تھا کہ وہ لوگ اب تک بہت دور جا چکے ہوں گے۔

♦♦♦

زہر کے پیالے کا گھونٹ گھونٹ پی لینا..... آگ میں اتر جانا، سر کو آسمان رکھنا کافی دیر پہلے، جس وقت ہاشم کا رد ار سعدی سے فون پہ اس کے ڈاکومنٹس لانے کی بات کر رہا تھا اس سے کچھ دیر بعد وہ دونوں سڑک کنارے بنے اس مین ہول کے اوپر رکھی لوہے کی پلیٹ اٹھا کر باہر نکل رہے تھے۔ سونی کا ٹیب وہ سروس باتھر روم تک جاتے ہوئے راستے میں ایک سیاح بچی کے بیک پیک میں گرا کر آگے بڑھ گیا تھا۔

اندھیر سڑک پہ وہ تیزی سے باہر نکلے اور لوہے کی پلیٹ برابر کر کے اسی طرح آگے بڑھتے گئے۔ سڑک قریباً سنسان تھی۔ عموماً وہ پر رونق ہوتی تھی مگر چونکہ یہ پراہر کاروٹ نہیں تھا سوسارے لوگ گویا یہاں سے سمٹ کر ادھر جا چکے تھے۔ جو پھر رہے تھے انہوں نے بیک پیک اور ٹارچز پکڑے دو آدمیوں کو مین ہول سے نکلتے دیکھ کر ان کو صفائی یا ہیمنگ کا عملہ خیال کیا اور نظر انداز کیا۔

”ان کو تیس منٹ لگیں گے کم از کم اس مین ہول کا معلوم ہونے میں۔“ خاور نے تیز تیز چلتے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ سعدی خاموشی سے چلتا رہا۔ وہ اتنے دنوں... ہفتوں... مہینوں بعد... تازہ ہوا میں آیا تھا... سر اٹھا کر پورے چاند کو دیکھا جو سیاہ آسمان پہ دک رہا تھا۔ پویا۔ ماہ

کال! اور اس کی چاندنی میں نیچے بہتے پراہر کی موسیقی اور شور یہاں تک سنائی دے رہا تھا۔ ایک موڑ مڑ کر خاور نے لبوں میں انگلی ڈال کر سیٹی بجائی۔ تین دفعہ فوراً سے ایک ٹک ٹک tuk tuk (سری لنکن رکشا) تیزی سے چلتا ان کے قریب آکا۔ وہ دونوں جلدی سے اس میں بیٹھے اور ٹک ٹک سڑک پہ گویا اڑتا ہوا دور چلا گیا۔

”اور یقیناً یہ ٹک ٹک ڈرائیور بھی تمہارا جاننے والا ہوگا؟“ سعدی نے تیز ہوا کے شور میں اونچی آواز سے ساتھ بیٹھے خاور سے پوچھا۔

”میں نے اس شہر میں ہاشم کا ردار کے لئے برسوں کام کیا ہے۔ کیا میرے چند وفادار کانٹیکٹس بھی نہیں ہوں گے یہاں؟“ وہ بگڑ کر بولا تھا۔ سعدی مسکرا کر رہ گیا۔ مگر وہ جانتا تھا ابھی وہ آزاد نہیں ہے۔

جب تک ہاشم کا ردار کے آدمی اس میں ہول تک پہنچے وہ دونوں مفروضہ قیدی وہاں سے بہت دور جا چکے تھے۔



اب یہ داغ بھی سورج بن کر انہر انہر چمکے گا جس کو ہم نے دامن دل میں اتنی عمر چھپایا ہے ہارون اور آبدار کے جانے کے بعد وہ دونوں میز سے اس ارادے سے اٹھے تھے کہ اب ہوٹل سے باہر نکلیں مگر باہر جانے کے بجائے لان میں چلے آئے اور قدم خود بخود پول کے قریب اٹھتے گئے۔ ندرت کا فون آیا تو فارس نے کہہ دیا کہ وہ دیر سے واپس آئیں گے۔

”تم واپس نہیں جانا چاہتے؟“ اس کے ساتھ چلتے ہوئے زمر نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے قدم اٹھا رہا تھا۔ کسی سوچ میں گم تھا۔

”کیا اپنی گرل فرینڈ کو مس کر رہے ہو؟ اسے کال کر لو شاید کوئی بات رہ گئی ہو جو اس نے تم سے نہ پوچھی ہو۔“ ہمدردی سے مشورہ دیا۔ فارس نے سنہری آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور ذرا سا مسکرایا۔

”تمہیں اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ معصوم سی لڑکی ہے۔ سادہ اور مذہبی سی۔ وہ مجھ میں بالکل بھی انٹرسٹ نہیں ہے۔“ پول کے کنارے وہ دونوں آمنے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔ اوپر تاریک رات میں چمکتا پورا چاند پول کے نیلے پانی پہ جھللا رہا تھا اور پانیوں کی روشنی زمر کے چہرے پہ پڑ رہی تھی جو بخیدہ ہو گیا تھا۔

”نہ وہ معصوم ہے نہ مذہبی۔ اس کا سکارف ایرانی کلچر کا حصہ ہے یا اس کو اپنے بال نہیں پسند۔ مذہبی اسکارف ایسا نہیں ہوتا۔ مجھے تو وہ ایک بگڑی بچی کے سوا کچھ نہیں لگی۔ خیر وہ اتنی اہم نہیں ہے کہ ہم اس کو ڈسکس کریں۔ تم بتاؤ گھر کیوں نہیں جانا چاہتے؟“ سینے پہ بازو لپیٹے وہ پوچھ رہی تھی۔ گھنگریا لے بھورے بال سمیٹ کر چہرے کے بائیں طرف ڈال رکھے تھے اور بھوری لائینر سے مزین آنکھیں سکیڑ کر اس پہ جما رکھی تھیں۔ ناک میں پڑی سونے کی بالی ماہ کامل کی چاندنی میں دمک رہی تھی۔

”مجھے ڈپریشن ہوگا زمر۔ میرے لئے پہلی رات ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ تھانے کی پہلی رات، جیل کی پہلی رات، دوبارہ گرفتاری پہ جیل کی پہلی رات اور اب...“ سر جھکائے جوتے کی نوک سے گھاس کو مسلتے وہ کہہ رہا تھا۔ ”وہ گھر میرے لئے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ مجھے بہت پیارا تھا۔ اس کو بیچ کر میں خوش نہیں ہوں۔“

”اب کیا کرو گے؟“ جب کب ڈھونڈو گے؟“ وہ فکر مند تھی۔ وہ باپ بیٹی ذہن سے محو ہونے لگے۔

”مل جائے گی جب۔ نہیں تو پیسے ہیں میرے پاس۔ چھوٹا موٹا کاروبار تو کر ہی سکتا ہوں۔“ کندھے جھٹک کر لا پرواہی سے بولا تھا۔

”ندرت بھابھی چاہتی ہیں کہ تم ریسٹورانٹ میں ان کے ساتھ شراکت داری کرلو۔ یا اوپر والے پورشن میں کچھ بنالو۔“

اس نے استہزائیہ سر جھٹکا تھا۔ ”وہاں سارے رشتے دار آتے ہیں ہمارے، میں ان سے نہیں ملنا چاہتا۔“
 ”فارس تم بے گنا ہو، عدالت نے تمہیں بری کیا ہے تو کیوں بھاگتے ہو اپنے رشتے داروں سے؟“

”زمر بی بی! لوگوں کو اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ یہ آدمی بے گناہ تھا یا گناہگار۔ جیلوں میں جانے والے نوے فیصد لوگ مجرم ہوتے ہیں مگر لوگ سمجھتے ہیں سب مجرم ہیں۔ جن نظروں سے میرے رشتے دار مجھے دیکھتے ہیں، میرے قریب آنے پہ میرے بارے میں سرگوشیاں کرتے ہیں، ان پہ خون جلانے کے لئے میرے پاس نہ وقت ہے نہ توانائی۔“ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور پول کے کنارے بیٹھ گیا۔ زمر بھی گہری سانس لے کر ساتھ آ بیٹھی۔ ڈنر کے دوران کی گئی جیل کی باتوں نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔

”میں چاہوں بھی تو تہرے قتل کے الزام سے کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ میں کبھی بھی نارمل نہیں ہو سکتا۔“ وہ سنجیدگی سے سر جھکائے

کہہ رہا تھا۔

”مگر میں ہونا چاہتی ہوں۔“ وہ گھنٹوں پہ تھوڑی ٹکائے، پورے چاند کو پانی میں تیرتے دیکھ کر گویا خود سے بولی تھی۔ ”میں بھی اس برف کو پگھلانا چاہتی ہوں۔ مگر مجھے نہیں پتہ میں کیا کروں۔ تمہارے بارے میں سوچوں یا نہیں؟“
 فارس نے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ اداس نظر آ رہی تھی۔

”تمہارا اور میرا ایک ساتھ کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اس رات جو میں نے اس ریٹورنٹ میں کہا تھا، میں اس کے لئے شرمندہ ہوں، مگر وہ سچ تھا۔ جلد یا بدیر ہم الگ ہو جائیں گے۔“ مگر زمر نے اس دفعہ برا نہیں مانا۔ وہ نارمل رہی۔

”تو پھر کب دے رہے ہو تم مجھے طلاق؟“ پول میں جیسے چاند سے کوئی چیز آن گری تھی۔ کچھ چٹخنے کی آوازی آئی۔

”طلاق الگ ہونے کا واحد راستہ نہیں ہوتی۔ گو کہ میرے دل میں تمہارے لئے کوئی عناد نہیں ہے۔ صرف محبت ہے۔ عزت ہے۔ مگر میں ایک cursed آدمی ہوں۔ میرے ساتھ بہت سے مسئلے ہیں۔ میرے دشمن ہیں۔ میری دشمنیاں ہیں۔ میں بہت جلد خود کو تم سے الگ کر دوں گا، تا کہ میری curse تمہیں مزید نقصان نہ دے۔ پہلے بھی تمہارا بہت نقصان ہو چکا ہے۔“

”وہ میری قسمت تھی، فارس!“ زندگی میں پہلی دفعہ اس نے تسلیم کیا۔

”وہ میرا قصور تھا۔ میں اپنے سے جڑی کسی عورت کی حفاظت نہیں کر سکتا۔“ وہ پول کے پانی کو دیکھتے ہوئے یاسیت سے کہہ رہا تھا۔

”مگر...“ اس نے گہری سانس لی۔ ”جب تک ہم ساتھ ہیں، ہم خوش تو رہ سکتے ہیں نا، زمر! ایک اچھے کیل کی طرح اور...“ زمر سے

کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا جب فارس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے ایک نظر دیکھا۔ آپا کالنگ۔ اس نے کال کاٹ کر فون آف کر دیا۔

”ہماری کریزی فیملی ہمیں خوش نہیں رہنے دے گی۔“ وہ جل کر بولا تھا۔ ”جب بتا دیا ہے کہ نہیں آ رہے ہم گھر تو بار بار کال کر کے

بلائیں گے کہ جھنڈی گوشت بنا ہے، آ کر کھا لو۔“ وہ ایک دم زور سے ہنسی۔ دفعۃً اس کا اپنا موبائل بھی تھر تھرانے لگا۔ زمر نے ہنسی روک کر

اسکرین فارس کے سامنے لہرائی۔ ”حنین کالنگ۔“ اور کال کاٹ دی۔ وہ سلسلہ کلام جوڑنے ہی لگا تھا کہ گھر کے پی ٹی سی ایل سے کال آنے

لگی۔ اسے یاد تھا کہ نئے گھر میں صبح ہی حنہ نے فون کی تار وغیرہ جوڑ دی تھی۔ وہ پھر سے کال کاٹ کر فارس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تم کیا کہہ رہے تھے؟“ انجان بن کر پوچھا۔ بازو گھنٹوں کے گرد لپیٹ کر وہ بیٹھی تھی اور سیل ابھی تک ہاتھ میں تھا۔

”یہی کھل کی کھل دیکھیں گے۔ کیا پتہ ہم کبھی الگ نہ ہوں۔ کیا پتہ سب ٹھیک ہو جائے۔ تو پھر...“ بیٹھے بیٹھے وہ اس کی طرف گھوما

اور زمری سے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ”زمر یوسف خان، کیا تم فارس غازی کی بیوی کی حیثیت سے ایک نارمل زندگی گزارنا چاہو گی؟“ زمر نے

بے اختیار انڈر آئی مسکراہٹ دکائی۔

”پہلے مجھے آپ کہو۔“

فارس نے سرکواشات میں خم دیا اور ذرا سا کھٹکھارا۔ ”زمر یوسف خان...“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر آہستہ آہستہ سے دہرایا۔ ”کیا تم فارس غازی کی بیوی کی حیثیت سے نارل زندگی گزارنا چاہو گی؟“

اور فارس غازی کو کون کسی بات کے لئے مجبور کر سکتا تھا؟ ہاں صرف وہی مجبور کر دیتا تھا۔ زمر نے گہری سانس اندر کو کھینچی۔ ”نمبر ایک“ میں تمہاری ریسٹورانٹ والی کوئی بات نہیں بھولی، ”نمبر دو...“

”میں تمہارے چودہ نکات سن چکا ہوں اب تم...“

فون ایک دفعہ پھر زوں زوں کرنے لگا۔ غیر شناسا نمبر تھا۔ فارس کے ابرو تنے۔

”مجھے سننے دو کوئی ضروری کال نہ ہو۔“ اس نے موبائل کان سے لگایا۔ ”ہیلو؟“ فارس غور سے اس کے تاثرات دیکھنے لگا۔

”کون؟ حسینہ؟ اچھا یہ تمہارا نمبر ہے۔“ اور اس سے زیادہ فارس غازی سے برداشت کرنا مشکل تھا۔ فون زمر کے کان سے نوجا اور

اپنے کان سے لگایا۔

”حسینہ تم اسی وقت اپنی نوکری سے فارغ ہو۔ سامان سمینو، اور اپنی شکل گم کرو۔ میرے واپس آنے تک اگر تم مجھے نظر آ گئیں تو اچھا

نہیں ہوگا۔“ غصیلے اور اکھڑ لہجے میں ڈپٹ کر اس نے فون بند کیا۔

”سائیلٹ کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اس وقت تم صرف مجھے سنو۔“ موبائل اس نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ (زمر سمجھی اس نے

واقعی سائیلٹ کیا ہے، مگر اس نے خاموشی سے فون آف کر دیا تھا۔)

”کیا سنو؟“ وہ تھوڑی گھٹنے پہ رکھے دلچسپی سے اسے دیکھنے لگی۔ نیلے پول کے اوپر جھلملاتی چاندی منعکس ہو کر فارس کے چہرے

پہ پڑ رہی تھی۔ ارد گرد ٹپلتے لوگوں سے بے نیاز وہ بس اس کو دیکھنے لگی۔ سویٹر کے آستین ذرا پیچھے چڑھائے، منہ میں کچھ چباتے ہوئے وہ پانی کو

دیکھ رہا تھا۔ اس کے سوال پہ سنہری آنکھوں کا رخ اس کی طرف موڑا۔

”مجھے نوٹس ملے تھے۔“

”سوری؟“

”تمہاری کلاس میں جو نوٹس تم نے کاپی کروا کر دیے تھے وہ مجھے ملے تھے۔ میں نے پھینک دیے تھے۔ مجھے تم سے ریمریڈ نل کلاس

لینے کا بہانہ درکار تھا۔“

زمر کے ابرو استعجاب سے اٹھے۔ چہرہ گھٹنے سے اٹھالیا۔ ”تمہیں وہ سب لیکچرز، وہ ٹاپکس سمجھ آتے تھے؟ پھر میں کیوں گھنٹہ گھنٹہ

تمہارے ساتھ کھپاتی تھی؟“ وہ برا نہیں مانی تھی۔ اسے دھکا سا لگا تھا۔ اس نے فارس غازی کو کبھی ذہن نہیں سمجھا تھا، اور اس کی بڑی وجہ وہ ٹیوشن

تھی جو وہ اسے دیتی تھی۔ ایک ہی ٹاپک بار بار اس کو پڑھانا پڑتا تھا۔

”مجھے ہر چیز سمجھ آتی تھی زمر بی بی۔ صرف آپ نہیں سمجھتی تھیں۔“ اب کے وہ مسکرایا تھا۔ وہ خفاسی چپ ہو رہی۔

”اور وہ لڑکا جمشید جس کو آپ میرے ساتھ ٹاپک سمجھانے لے آئی تھیں لا بریری... بہت برا لگا مجھے۔ اس کا سیل فون میں نے غائب

کیا تھا اور اس کو ڈھونڈنے وہ بے چارہ اٹھ کر گیا تھا۔ مگر آپ سمجھیں وہ لا پرواہ ہے اس لیے دوبارہ آپ نے اس کو نہیں پڑھایا۔“

”تم ہمیشہ سے ایک دو نمبر انسان تھے۔“

”اور وہ بندہ جو آپ کو ہراس کر رہا تھا... اور آپ میرے پاس آئی تھیں۔“ وہ محظوظ سا اسے بتا رہا تھا۔ ”اور میں نے آپ سے وعدہ

کیا تھا کہ اس سے بات کروں گا۔ جانتی ہیں میں نے کیا کیا؟“

”جانتی ہوں۔“ سابقہ ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر نے چہرہ آگے جھکا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ فارس بالکل ٹھہر گیا۔

”تم اسے اپنے کسی ٹارچر سیل لے کر گئے اور اسے مارا پٹا۔ ہے نا؟“

وہ لمحے بھر کے لیے لاجواب ہوا۔ ”اس نے آپ سے کچھ کہا تھا بعد میں؟“

”فارس... تمہارے پاس کیوں آئی تھی میں؟ اگر اس سے صرف بات کرنی ہوتی تو میں خود کر لیتی۔ مجھ سے بہتر manipulative talk کون کر سکتا ہے بھلا؟ تمہیں اس لیے کہا کیونکہ تمہاری جاب... اور تمہاری شہرت کبھی تھی کہ تم اس کی طبیعت اس طریقے سے ٹھیک کر لو گے جس طریقے سے میں کروانا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ تم اس کو مارو۔ وہ باتوں کا بھوت نہیں تھا۔“ اور ابرو اٹھا کر (فاتحانہ) تائید چاہی۔ وہ چند ثانیے کو چپ رہا۔ پھر سر جھٹکا۔

”تم میں اور مسز کاردار میں کبھی کبھی مجھے زیادہ فرق نہیں لگتا۔“ پھر جیسے کچھ پوچھنے لگا، مگر ارادہ بدل دیا۔ کم از کم آج کی رات نہیں۔

”اور بتاؤ۔ اور کیا کچھ کر چکے ہو تم میرے علم میں لائے بغیر؟“ مسکرا کر پوچھنے لگی۔ فارس نے گھڑی پہ وقت دیکھا۔

”پہلے چل کر کھانا کھاتے ہیں۔ ہارون عبید کا حرام کا مال تھوڑا بہت زہر مار کیا تھا۔“ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ویسے بھی ہمارے پاس ابھی

بہت وقت ہے۔ کم از کم آج کی رات ہم واپس نہیں جا رہے۔ یہیں رہتے ہیں۔“

”اتنے مہنگے ہوٹل میں؟“ اس نے گردن اٹھا کر استعجاب سے اسے دیکھا۔

”روز روز تھوڑا ہی کرتا ہوں آپ پہ اتنا خرچ؟“ مسکرا کر اس نے ہاتھ بڑھایا۔ اور پگھلنے والے انکار نہیں کیا کرتے۔ وہ اس کا ہاتھ

تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب پول کنارے وہ دونوں ایک دوسرے کے مد مقابل کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے۔

”تم ہمیشہ میرے سامنے ایک مختلف روپ میں آتے ہو۔ پہلے تم میرے رشتے دار تھے۔ پھر اسٹوڈنٹ بنے۔ پھر میرے مجرم۔ پھر

ایک کاغذی انتقامی رشتے کا ایک پرزہ۔ پھر سعدی کے لیے میرے پارٹنر بنے۔ پھر ایک بے گناہ انسان کی حیثیت سے میرے سامنے کھلے۔ پھر

میرے کلائینٹ بنے۔ اب شوہر بن جاؤ گے۔ پتہ نہیں پھر کس روپ میں سامنے آؤ گے؟ کیا ابھی بھی کچھ ایسا ہے جو میں نہیں جانتی تمہارے

بارے میں؟“

”ہاں۔ یہی کہ تمہارے کلائینٹ کا تمہاری فیس ادا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے!“ وہ اس سوال سے بچتا تھا سو مسکراہٹ دبا کر بولا تو

وہ ہنس دی، پھر مصنوعی خفگی سے بولی۔

”نمبر ایک‘ اب مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ تم اور میں مستقبل میں ساتھ رہیں گے یا نہیں‘ میں مزید کوئی پلاننگ کیے بغیر‘ نفع

نقصان سوچے بغیر‘ اس شادی کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر نمبر دو‘ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے دل میں تمہارے لئے کوئی فیملنگر ہیں‘

کیونکہ نمبر تین‘ میں تمہاری ریسٹورانٹ والی کوئی بات نہیں بھولی‘ اور نمبر چار‘ ابھی تک...“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے

بولی۔ ”آئی ہیٹ یو!“

وہ مسکرا کر اس کی طرف جھکا۔ ”آئی ہیٹ یو ٹو۔“

اور اس نے بہت دقت سے مسکراہٹ لیوں پہ روکی تھی۔ چاندی میں نہائے جھللاتے پانی کے ساتھ سبزہ زار پہ وہ دونوں ساتھ ساتھ

آگے بڑھنے لگے۔ اور اوائف صحیح کہتا تھا۔ کچھ لوگ واقعی اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے لئے پگھلا جائے۔

برا نہ مان۔۔۔ مرے حرف زہر سہی میں کیا کروں کہ یہی زباں کا ذائقہ ہے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آئی تو اس نے فوراً سے پہلے میمونہ کو کال ملائی۔ میمونہ اس سے دو سال سینئر تھی۔ کالج میں دونوں ساتھ تھے۔ کسی کام کے سلسلے میں تعارف ہوا اور پھر دوستی ہو گئی۔ وہ حافظ قرآن تھی اور شادی شدہ تھی۔ ایک بیٹا بھی تھا۔

”میمونہ باجی آپ میری نماز گنہبان بنیں گی کچھ دن کے لیے؟“ مہذب انداز میں مدعا بیان کر کے اس نے پوچھا۔

”جین! دیکھو میں اول تو کسی کی ذمہ داری لیتی نہیں لیکن اگر لوں تو اسے آخری سانس تک نبھاتی ہوں۔ میں ہر روز فجر کی اذان کے پینتالیس منٹ بعد تمہیں کال کر کے پوچھوں گی کہ تم نے نماز پڑھی یا نہیں۔ اور روزرات کو تمہیں مجھے ٹیکٹ کر کے بتانا ہوگا کہ آج تم نے ۵ میں سے کتنی نمازیں پڑھی ہیں۔ جس دن تم کو تاہی کرو گی میں تم سے وضاحت مانگوں گی اور مجھے امید ہے کہ تم خود کو اور مجھے شرمندہ نہیں کرو گی۔“

میمونہ سے دیے ہی ایک ریزروڈ سارشتہ تھا اب تو مزید لحاظ آ گیا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”ان شاء اللہ میں صبح اٹھ جاؤں گی۔“

اور زندگی میں پہلی دفعہ جین یوسف کو سمجھ آیا تھا کہ بچے کو نماز پڑھانے کے لیے ماں باپ کو ان پر سختی کیوں کرنی چاہیے۔ عادتیں ڈالنے کے لیے سختی کرنی پڑتی ہے۔ اس نے فون بند کر کے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

”اللہ تعالیٰ ہمیشہ میں سے الارم کلاک پہ بھروسہ کیا ہے مگر آج نہیں۔ کل صبح آپ مجھے اٹھائیں گے۔ مجھے نہیں پتہ کیسے یہ میرا مسئلہ نہیں ہے، لیکن آپ مجھے اٹھائیں گے۔ ہر حال میں۔“

ان سے دور.... کولمبو کی اس برف رات میں تیزی سے بھاگتا ٹک ٹک بالآخر ایک جگہ رکا۔ وہ دونوں بنا کچھ کہے اترے اور پھر جہاں خاور چلتا گیا وہ اس کے ساتھ کھینچا چلا آیا۔ سڑک پار کرتے وہ دفعتاً رکا۔ سر کو جھٹکا۔ گلے پہ ہاتھ رکھا۔ خاور نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا ہوا؟“

”یونہی۔ منہ کا ذائقہ عجیب سا ہوز ہا ہے۔ شاید گلا خراب ہے۔“ الجھن سے سر جھٹکتا وہ آگے بڑھ گیا۔ سڑک کے کنارے سے انہوں نے ایک اور ٹک ٹک روکا اور یوں تقریباً تین سواریاں بدل کر وہ دونوں اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے رکے۔ اندر بیڑھیاں چڑھتے سعدی نے پوچھا تھا۔ ”تو اس عمارت میں ہے تمہارا خفیہ فلیٹ جس کے بارے میں کاردار نہیں جانتے؟“

”میرے پاس ایسی کئی خفیہ جگہاں ہیں۔“ وہ ماتھے پہ بل لئے کھردرے لہجے میں بتاتا زینے چڑھتا گیا۔

فلیٹ معمولی اور سستا تھا۔ سعدی گردن ادھر ادھر گھماتا، طائرانہ نظروں سے جائزہ لیتا اندر داخل ہوا۔ بیگ صوفے پہ دھرا۔ خاور سیدھا اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ سعدی چوکھٹ پہ آیا تو دیکھا۔ خاور کا ریٹ ہٹا کر نیچے زمین پہ جھکا ہوا تھا، اور فرش کے اندر بنے ٹریپ ڈور سے ایک باکس نکال رہا تھا۔ سعدی آگے آیا۔ وہ ایک دھاتی باکس تھا۔ (ایسے باکس کو Go باکس کہتے ہیں۔) اس میں خاور کے نام کے تین پاسپورٹ تھے، پاسپول تھا اور تم کی گڈیاں تھیں۔ ایمر جنسی میں بھاگتے وقت کا سارا سامان گو باکس میں موجود تھا۔

”اب ہمارے پاس پیسے بھی ہیں اور پلان بھی۔ اب سعدی ہمیں فیئر ٹوپہ عمل کرنا ہے۔“ وہ نوٹ نکال نکال کر باہر رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”یعنی کہ ہم نے تمہارا نام کلیر کروانا ہے، ہاشم کے سامنے تمہیں بے گناہ ثابت کرنا ہے۔ جانتا ہوں۔“ وہ کندھے اچکا کر مڑا۔

پھر دروازے کی چوکھٹ پکڑ کر کاکا ہکا سادہ ہوا۔ خاور نے پھر سے چونک کر اسے دیکھا۔ ”مسئلہ کیا ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں شاید کچھ غلط کھا لیا تھا۔“ وہ سر کو پھر سے نفی میں جھٹکتا، باہر لاؤنج میں چلا گیا۔ ذرا دیگڑی تو خاور کو اس کے کھانسنے کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے اٹھا اور باہر کولپکا۔

کچن سنک پہ جھکاؤ دہرا ہوتا ہے کر رہا تھا۔

”کیا کھایا تھا تم نے؟“ خاور تشویش سے کہتا اس کے سر پہ آپہنچا۔ وہ دہرا ہوا، نڈھال سا چہرہ جھکائے، مزید قے کے لئے منہ کھولے ہوئے تھا۔ نقاہت سے کراہ بھی رہا تھا۔

”میری نے... شاید کھانے میں کچھ ملایا تھا۔“

”ٹھہر و شاید کوئی دوا رکھی ہو تمہاری جان میرے لئے بہت قیمتی ہے۔“ کہہ کر وہ دوسری طرف لپکا اور کیبنیٹ کھولی۔ دفعتاً خاور ٹھہرا۔ ”مگر... ایک منٹ... ہم نے تو اس کھانے کو چکھا ہی نہیں تھا۔“ وہ چونک کر پلٹنے لگا تھا کہ...

اس کے سر کی پشت پہ زور سے کوئی بھاری چیز آ کر لگی۔ خاور بے اختیار آگے کوڑھکا، مگر پھر ہاتھ سلیب پہ رکھے، سنبھلنا چاہا، لیکن سعدی نے پیچھے سے اس کی گردن دبوچی، اور مخصوص رگ کو دباتا گیا۔ خاور نے پوری قوت سے مزاحمت کرنی چاہی، ہاتھ پیر مارے... سلیب سے شیشے کے گلاس گر کر ٹوٹ گئے، مگر اس کی مزاحمت دم توڑتی گئی اور گردن ڈھلک گئی۔

”آف کورس ہم نے وہ کھانا نہیں کھایا تھا۔“ اس کو کندھوں سے تھامے زمین پہ احتیاط سے لٹاتے ہوئے ہشاش بشاش سا سعدی بولا تھا۔ ”تمہیں بروقت یاد آ گیا، مگر بہت سی باتیں تم بھول گئے کرنل خاور۔“ اس کے سر پہ کھڑے وہ پریش نگاہوں سے اس کے بے ہوش وجود کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ ”یہی کہ اپنے دشمن کو درخت پہ چڑھنا نہیں سکھاتے۔ تم اور میں دشمن تھے، ہیں اور رہیں گے۔ تم نے میرے وعدے پہ اعتبار کیا۔ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں وہ سچا ایماندار سعدی یوسف نہیں رہا جو وعدے سے نہیں پھرے گا۔ کماری موت کے ساتھ وہ کھو گیا ہے۔ تمہارا نام کلیئر کروانے کا ارادہ نہ میرا کل تھا نہ آج ہے۔ میں نے تمہیں صرف استعمال کیا ہے کیونکہ صرف تم اس جیل کو توڑنے میں میری مدد کر سکتے تھے۔ اور وہ تم نے کر دی۔ تھینکس، بٹ نو تھینکس۔“ کہہ کر وہ اندرونی کمرے کی طرف چلا گیا۔ اور جب باہر آیا تو کندھے پہ بیگ میں خاور کی تمام رقم اور اسلحہ رکھا تھا۔ اس کا ایک پاسپورٹ بھی وہ لے آیا تھا۔ باقی چھوڑ آیا تھا۔ ایک نظر اس نے کچن میں بے سدھ گرے خاور پہ ڈالی، اور پھر وہ پل کیپ اٹھائی جو کارنس پہ دھری تھی، اور اسے پسپے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

دروازہ باہر سے بند کرنا وہ بالکل نہیں بھولا تھا۔ تیز تیز زینے اتر کر وہ عمارت سے باہر نکل آیا، اور اب پورے چاند کی اس منج بست رات میں اندھیر سڑک پہ اپنا پل کیپ والا سر جھکائے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے، کندھے پہ بیگ لٹکائے، وہ دور چلتا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ آزاد تھا۔



زخم جتنے بھی تھے سب منسوب قاتل سے ہوئے تیرے ہاتھوں کے نشان اے چارہ گرد دیکھے گا کون؟ ہوٹل کے ملوکانہ سویٹ میں بیڈ پہ سوئی، کبیل میں دہکی، بے خبر سو رہی تھی، اور وہ بھی سوئی کی طرح مطمئن سا ناگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا جواہرات کو دیکھ رہا تھا جو بے چینی سے ادھر ادھر چکر کاٹ رہی تھی۔ جب تک وہ ان کا پیچھا کر سکتا تھا اس نے کیا، لیکن جب یہ یقین ہو گیا کہ وہ ان کی قید سے نکل چکے ہیں تو ہاشم الطمینان سے اس صوفے پہ آ کر بیٹھ گیا تھا۔

”اب کیا ہوگا ہاشم؟ وہ دونوں نکل گئے۔“

”سعدی کی تصویر سے ملتا جلتا اسکیچ، اور خاور کی اصلی تصویر پولیس کو دے دی ہے۔ وہ ان منگ لوگوں کی تلاش شروع کر چکی ہے۔ ہمارے آدمی بھی لگے ہیں۔ جیل کو ہم نے صاف کر کے اس میں فالتو سامان بھر دیا ہے، اور اب وہ ہیمنٹ اسٹور سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ہم ان کو نہ بھی پکڑ سکے، تب بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ سعدی کو ہم نے قید کر کے رکھا تھا۔“

”ثبوت!“ اس نے بے یقینی سے ہاشم کو دیکھا۔ ”ثبوت کی پرواہ کسے ہے؟ سعدی چھوٹے ساتھ ہی گھر کال کرے گا اور سب کو

”ان کے تمام نمبرز ہم ٹیپ کر رہے ہیں، سری لنکا سے آنے والی کال پکڑی جائے گی۔ ہمیں علم ہو جائے گا۔“
 ”وہ ای میل کر سکتا ہے اور چلو کال تم پکڑ بھی لو تو وہ تو ان کو سب بتا چکا ہوگا۔ اتنا عرصہ اس کو اس لئے قید رکھا تا کہ وہ ہمارے راز کھولے اور اب...“ وہ شدید پریشان تھی۔ ہاشم نے اچنبھے سے ابرو اٹھائی۔
 ”آپ کے خیال میں اسے اتنا عرصہ اس لئے مقید رکھا کیونکہ میں اس کے منہ کھولنے سے ڈرتا تھا؟ میں...“ اپنے...“ لئے ڈرتا تھا؟“
 ”ظاہر ہے، ہمیں ہی نقصان ہوگا اس کا منہ کھلنے سے۔“
 ”مُمی! اگر میں اس سے ڈرتا ہوتا تو شیر کی بجائے میں نے اس کے گولیاں ماری ہوتیں، مگر میں نے تب بھی بار بار شیر سے کہا تھا کہ میں سعدی کو سنبھال لوں گا۔ مُمی! اس کے منہ کھولنے سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہے۔“ صوفی کی پشت پہ بازو پھیلائے، وہ مطمئن سا دیکھتا تھا۔

”تو پھر؟ ہم نے کیوں اسے اتنا عرصہ خاموش کرائے رکھا؟“
 ”کیونکہ بول کر وہ اپنی فیملی کو خطرے میں ڈالے گا۔ مجھے اس کی فیملی کی فکر تھی۔ میں نہیں چاہتا کہ ان لوگوں کے ساتھ مزید پچھ ہو۔ لیکن اگر وہ بولے گا تو ظاہر ہے مجھے ان سب کو ”فکس“ کرنا پڑے گا۔ جتنے لوگوں کو بتائے گا اتنے لوگ ہمارے نشانے پہ آجائیں گے۔ ہمیں“ کوئی نقصان نہیں ہو سکتا مُمی“ ”وہ“ اس وقت Vulnerable ہے۔“
 جواہرات بالکل ساکت سی ہو کر اسے دیکھ گئی۔ ”ایک قاتل ہونے کی حیثیت سے تمہیں یہ ڈر نہیں ہے کہ اگر وہ تمہارے قتل کے راز کھول دے تو تم دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے؟“ اس کی آواز میں اس کا اپنا اندرونی ڈر غالب تھا۔
 ”مُمی!...“ اس نے حیرت بھری مسکراہٹ سے ماں کو دیکھا۔ ”وہ مجھ پہ الزام لگائے گا تو کیا دنیا اس پہ یقین کر لے گی؟
 It would be his word against mine !۔ وہ کیا ہے؟ منج کو بلیک میل کرنے والا؟ ایک گارڈ کو قتل کرنے والا؟ اور اسکے اپنے مبینہ قاتل نے اس کے بارے میں اعتراف جرم میں کہا تھا کہ وہ منشیات کی خرید و فروخت میں ملوث تھا۔ ایسے شخص کی اہم کریڈیٹبلیٹی ہوتی ہے؟ اور میں کیا ہوں؟ شہر کے بااثر و کلاء میں سے ایک... آئل لابی کا کنٹرولر... Philanthropist... جس کو کبھی اس کی کمٹل کیس میں مطلوب نہیں قرار دیا گیا... میں وائٹ کالر باعزت آدمی ہوں، میری ایک کریڈیٹبلیٹی ہے۔ میرے مقابلے پہ اس کی بات کا کون یقین کرے گا؟ فرق اس سے نہیں پڑتا کہ کیا کہا جا رہا ہے؟ فرق اس سے پڑتا ہے کہ کون کہہ رہا ہے۔“ کوٹ سے نادیدہ گرد جھاڑتے ہوئے اس نے بے نیازی سے کہا تھا۔ جواہرات دھیرے سے کرسی پہ بیٹھی۔ اس کا دماغ ہنوز سُں تھا۔

”فرق اس سے نہیں پڑتا کہ آپ کے کون سے راز کس کے پاس ہیں۔ فرق اس سے پڑتا ہے کہ آپ کے محرم راز کی کریڈیٹبلیٹی اہم ہے۔“ وہ خود سے بولی تھی۔ ایک سکون سا تھا جو اس کے پورے وجود کو اپنی پلیٹ میں لیتا گیا۔
 ”لیکن اس کی فیملی تو اس کا یقین کرے گی، ہاشم! پھر کیا ہوگا؟“

”پھر؟“ وہ کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے اٹھا اور سنجیدگی سے ماں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پھر ہاشم سب سنبھال لے گا۔“ اور ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ جواہرات بھی اپنے کمرے میں جانے کے لئے اٹھ گئی۔ ایک طویل، سرد اور سنسنی خیز رات اپنے اختتام کو پہنچی تھی۔



صرف احساسِ ندامت اک سجدہ اور چشمِ تر اے خدا کتنا آسان ہے منانا تجھ کو
 اگلی فجر پہ دھند غائب تھی۔ بالکل نادر، صفر۔ بادل بھی عفا تھے اور جامنی آسمان صاف تھا۔ ابھی فجر میں چند ساعتیں باقی تھیں۔
 ایسے میں نئے گھر میں حنینِ رضائی میں لپٹی آنکھیں موندے بے خبر سو رہی تھی۔ ماتھے پہ کٹے بال نکھرے تھے اور باقی نیکیے پر پھیلے تھے۔ ایک